شامل ہے، باقی حصوں میں جامعہ سے متعلقہ موجودہ اداروں اور مختلف شعبوں کا جائزہ اور اس کے مرحوم امراء و شیوخ اور بعض مشہور اساتذہ کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے، یہ نمبر بڑی خوش مذاقی سے مرتب کیا گیا ہے، جو جامعہ سے متعلق جامع اور معلومات افزا ہے، لیکن شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ پر مضمون نہ ہونے کی کمی محسوس ہوتی ہے، نمبر کے خاتمہ پر روش صدیقی مرحوم کی جو اس تقریب کے وقت زندہ تھے، ایک موثر نظم درج ہے، اس کے آخری مصرعہ پر یہ تعارف ختم کیا جاتا ہے، ع

کاش اس آگ سے ہو شعلۂ ایماں پیدا

دیوان شاکر:۔ مرتبہ جناب نذر صابری و رفیق بخاری صاحبان، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۳۶، قیمت ؎ پتہ، مجلس نوادرات علمیہ، اٹک، کیمبلپور

یہ اٹک (ضلع کیمبلپور، پاکستان) کے بارہویں صدی ہجری کے ایک شاعر شاکر کے کلام کا مجموعہ ہے، انھوں نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی زبان کو اظہار خیالات کا وسیلہ بنایا ہے، اور عربی اور اردو میں بھی داد سخن دی ہے، اس میں اردو کی دو غزلیں شامل ہیں، شاکر نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، غزلوں کا حصہ زیادہ ہے، شروع میں حمد، مناجات و منقبت اور آخر میں قطعات و رباعیات، مرثیہ، مثنوی اور قصائد بھی ہیں، شاکر چونکہ دل شاعر تھے، اسلیے کلام میں عشق مجازی سے زیادہ عشق حقیقی کی گرمی اور مذہبی رنگ پایا جاتا ہے، اس مجموعہ سے ان کی قدرت کلام اور جوشِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے، مگر احتیاط و عقیدت کی بنا پر پورا کلام بلا انتخاب شائع کیا گیا ہے، جس میں پست و بلند ہر قسم کے شعر آگئے ہیں، ابتدا میں شاکر کے مختصر حالات اور خصوصیات کلام بھی تحریر کیے گئے ہیں، ایک گمنام شاعر کے کلام کی تلاش و جستجو اور اس کی اشاعت ایک ادبی خدمت ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۸ - ماہ جمادی الاخری ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۱ء - عدد ۲

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ دو مہینوں کے اندر اردو کے پرانے خدمت گذار خیر بہوروی اور نامور شاعر تسکین قریشی مرحوم نے انتقال کیا، خیر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ اردو کی خدمت میں گذرا، وہ برسوں انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ رہے، مولوی عبد الحق صاحب اور قاضی عبد الغفار صاحب مرحوم کے زمانہ میں انکی حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری کی تھی، وہ محض انجمن کے تنخواہ دار ملازم نہ تھے، بلکہ ان میں اردو کی خدمت کی لگن تھی، جس سے انجمن کے کاموں کو بڑا فائدہ پہنچا، انکی کوشش سے بعض مقامات پر اردو کانفرنسیں بھی ہوئیں، صاحب قلم بھی تھے، اور کبھی کبھی ادبی مضامین بھی لکھتے تھے، انجمن سے الگ ہونے کے بعد لکھنؤ میں میر اکیڈمی اور غالب اکیڈمی قائم کیں، جن سے حدیث میر اور مرقع غالب شائع کیں، باہر کے جو ادیب لکھنؤ آتے تھے، ان کو اکیڈمی میں مدعو کرتے تھے، اور بڑے شوق سے اس کے کاموں کو دکھلاتے تھے، ان کو جس پہلو سے بھی اردو کی خدمت کا موقع ملتا تھا، اس سے فائدہ اٹھاتے، اور انھوں نے اپنی بساط سے زیادہ اردو کی خدمت انجام دی، طبعاً بھی خلیق و شریف تھے، اللہ تعالیٰ اس شیدائے اردو کی مغفرت فرمائے۔

تسکین قریشی غزل گو شعرا میں نہایت ممتاز اور تغزل میں جگر کے صحیح جانشین تھے، وہ ملازم پیشہ تھے، اس لیے پیشہ ور شعراء کی کمزوریوں سے ان کا دامن پاک تھا، اور اپنی اخلاقی بلندی کے اعتبار سے شعرا کی آبرو تھے، طبعاً خاموش، عزلت پسند اور شہرت طلبی سے دور تھے، مشاعروں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے، اور اخبارات و رسالوں میں بھی اپنا کلام اشاعت کے لیے کم بھیجتے تھے، اس لیے ایک عرصہ تک ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن آخر میں ان کے کلام کی نکہت صاحب ذوق طبقہ میں پوری طرح پھیل گئی تھی، راقم کو ان کے کلام کا اندازہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "گلگونہ" کی اشاعت کے بعد ہوا، ان کی شاعری خیالات کی لطافت و پاکیزگی اور زبان کی نفاست و سلاست کا نمونہ ہے، نعتیں بھی بڑی پرکیف کہتے تھے، ان سے ملاقات کی نوبت کبھی نہیں آئی، مگر کبھی کبھی وہ اپنا کلام معارف میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، اس سلسلہ میں ان سے خط و کتابت رہتی تھی،

اور ان سے ایسے تعلقات ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنے آخری مجموعۂ کلام سرمایۂ تسکین کا مقدمہ راقم سے باصرار لکھوایا، وہ راسخ العقیدہ اور پابند مذہب مردِ مومن تھے، انکی موت سے ایک نامور اور شائستہ غزل گو شاعر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس صاحبِ دل شاعر کی مغفرت فرمائے۔

مسز اندرا گاندھی نے الیکشن کے زمانہ میں اردو زبان اور اقلیتی اداروں کے بارہ میں جو وعدے کیے تھے، اس کے نتیجہ میں اردو کے لیے فضا سازگار ہونے کے کچھ آثار ہیں، چنانچہ اتر پردیش کی حکومت نے مختلف شعبوں میں اردو کو جو سہولتیں دی ہیں یا دینے والی ہے، اس کی تفصیل شائع کی ہے، لیکن اصل سوال ان پر عمل کا ہے، اس سے پہلے کی حکومتیں بھی اس قسم کی سہولتوں کا اعلان کر چکی ہیں، مگر عملاً اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس میں حکومت کا قصور ہو یا ماتحت عملہ کا، مگر اس کی اصل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے، اگر وہ سنجیدگی سے کوئی حکم نافذ کرنا چاہے تو ماتحت عمال اس کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، آخر اردو ہی کے معاملہ میں ان کی یہ آزادی کیوں ہے. بہرحال اس قسم کے وعدے تو بہت سننے میں آچکے ہیں، اس نئے وعدہ کا بھی تجربہ کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک پہلو قابل غور ہے، اردو کے حقوق میں اصل اور بنیادی مسئلہ اس کی تعلیم کا ہے، جب تک یہ خاطر خواہ طریقہ سے حل نہیں ہوتا، اردو کو جو حقوق بھی ملیں گے ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بقدر ضرورت اردو کی تعلیم لازمی کر دی جائے، طلبہ کی تعداد کی شرط سے اسکولوں کے منتظمین کو اس کی تعلیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے، جس سے مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہونے پاتی، اردو کے اساتذہ اور نصاب کی کتابیں بھی نہیں ملتیں، اگر کسی طرح ان دشواریوں پر قابو بھی پا لیا جائے تو

یہ واقعہ ہے کہ اردو پڑھنے والے طلبہ صرف مسلمان ہوتے ہیں، جن کا ملازمتوں میں بہت کم گذر ہے، اور اعلیٰ عہدوں پر تو خال خال ہی نظر آتے ہیں، اور ان کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہے، ہندو طلبہ میں ہزاروں میں مشکل سے دو چار اردو پڑھنے والے نکلیں گے، اور یہی ملازمتوں میں جاتے ہیں، جو اردو سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے عدالتوں اور دوسرے شعبوں میں اردو کو جو حقوق ملیں گے اسکے سمجھنے والے کہاں ہونگے، اردو کے ٹرینڈ اساتذہ تک مشکل سے میسر آئیں گے، اسی لیے اردو کے بارہ میں حکومت جو ہدایتیں جاری کرتی ہے ان پر عمل نہیں ہو پاتا، اس کا حل صرف یہ ہے کہ آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم لازمی کر دیجائے، اسکے بغیر اردو کو دی ہوئی سہولتوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس سے ہندی کی برتری میں کوئی فرق نہیں آتا، وہ تو حکومت کی مسلمہ زبان ہے اور شروع سے آخر تک لازمی ہے، قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے کہ ہندی اور اردو والوں میں جو دوری اور بیگانگی ہے وہ دور کیجائے، اسکا ایک بڑا ذریعہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوں۔

اقلیتی اداروں میں سب سے بڑا مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے کردار کے تحفظ کا ہے، اس کا بل غالباً جلد ہی پیش ہو، اسکے متعلق اتنا لکھا جاچکا ہے کہ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں، حکومت بھی پوری طرح سمجھتی ہے کہ کردار کا مقصد کیا ہے، اور وہ کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے، سپریم کورٹ کے فیصلہ کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ بھی اپنی جگہ قانونی حیثیت سے صحیح ہے، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں نے قائم کی ہے، اور اس کے دروازے اگرچہ غیر مسلموں کے لیے کبھی بند نہیں رہے لیکن اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی ایسی تعلیم ہے جس سے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ انکی ملی خصوصیات بھی قائم رہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب یونیورسٹی کا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے، حکومت کی کم سے کم مداخلت ہو، محض مسلم کے اضافے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، یوں تو مسلمانوں کی بہت سی شکایتیں اور مطالبات ہیں، ان میں دو زیادہ اہم ہیں، اردو کا حق اور مسلم یونیورسٹی کے کردار کا تحفظ اگر یہ دونوں مطالبے پورے ہو جائیں تو مسلمان بڑی حد تک مطمئن ہو جائیں، گذشتہ الیکشن میں محض مسز اندرا گاندھی کی شخصیت کی بنا پر کانگریس کو مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہوا تھا جس سے اس کو بڑا فائدہ پہنچا، اس لیے اس اعتماد کو قائم رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے، اور وہ ان دونوں مطالبوں کو پورا کر کے اس اعتماد کو قائم رکھ سکتی ہیں۔

مقالات

ملا عبدالقادر بدایونی

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ملا عبدالقادر کی ولادت ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ٹونڈہ، بساور ضلع بدایوں میں ہوئی، ان کے والد کا نام ملوک شاہ تھا، خود ملا صاحب ان کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ "بحر علم" "معدن احسان" اور "کان فضل" تھے (منتخب التواریخ ج ۱ ص ۵۳) ملا صاحب کا بیان ہے کہ جب ان کی عمر بارہ ۱۲ سال کی تھی تو وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل گئے، اور میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو بہت بڑے عالم اور صوری اور معنوی کمالات کے حامل تھے، شیخ عزیز اللہ طلبنی سے بیعت تھے، ان کی خانقاہ میں رہ کر ملا صاحب نے قصیدہ بردہ کا درس لیا، ان سے تبرکاً حنفی فقہ کی کتاب کنز کے چند سبق بھی پڑھے، جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو میاں حاتم سنبھلی نے ان کو اپنے مریدوں میں داخل کر لیا، اور شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ بھی عطا کیا، تاکہ ان کو علوم ظاہری کا بھی فائدہ ہو (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۳) ملا صاحب نے سنبھل ہی میں قرآن پاک کی قرأت میر سید محمد مکی سے سیکھی، جو سات قرأتوں کے قاری تھے (ج ۲ ص ۲۱)۔ انھوں نے عربی علوم کی تحصیل اپنے نانا مخدوم اشرف سے بھی کی، (ج ۲ ص ۶۴)، کافیہ بیانہ کے ایک عالم شیخ سعد اللہ نحوی سے پڑھی، شرح شمسیہ مرزا سمرقندی سے اور وقایہ ابوالمعالی سے پڑھی،

چند روز شیخ ابوالفتح تھانیسری کے حلقۂ درس میں بھی رہے، شیخ عبداللہ بدایونی سے کلام تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھیں (ج ۳ ص ۲۹، ۱۵۱، ۱۴۹) اپنی فطری ذہانت اور صلاحیت سے فارسی، عربی، سنسکرت، تفسیر، تاریخ، شعر، ادب، حساب، موسیقی اور تاریخ گوئی میں بڑی مہارت پیدا کی، اور اپنے زمانے کے جلیل القدر اہل علم ہوئے، جس کے معترف اس زمانہ کے ارباب کمال بھی ہیں، فیضی ان کے فضل و کمال کا بڑا قدر دان تھا، اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:-

"بافضیلت علمی طبع نظم و سلیقۂ انشائی عربی و فارسی و چیزے از نجوم ہندی و حساب یاد داشت درجہ وادی و وقوف در نغمہ ولایت و ہندی و چیزے از شطرنج صغیر و کبیر دارد (ج ۳ ص ۳۰۴)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کو بہت عزیز رکھتے، وہ جب ان سے ملتے تو ان کے شوق و اشتیاق کی پیاس نہ بجھتی بلکہ اور بڑھ جاتی، ان کی ملاقات میں روحانی اور ربانی لذت محسوس کرتے، اپنے ایک مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں کہ خدا کے لیے مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ بند نہ کیجئے، اور اگر یہ راستہ ان کی طرف بند ہوگا، تو پھر ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا۔

"از برائے خدا بر من قافلہ اسرار خود راہ نہ بندند، و اگر از آں طرف بندند، از ایں طرف بستہ نخواہد شد (ج ۳ ص ۱۱۰)

ملا صاحب کے ایک اور معاصر بزرگ شیخ یعقوب کشمیری تھے، اکبر ان کے علمی فضائل اور روحانی کمالات کا بڑا قدر دان تھا، وہ ملا صاحب کو دوانی سے افضل تر سمجھتے تھے، لکھتے ہیں

"از دوانی بداؤنی بے شک در فنون فضیلت است فزوں (ج ۳ ص ۱۴۴)

بختاور خاں عالمگیری مراۃ العالم میں لکھتا ہے:-

"ملا عبدالقادر بدایونی جامع معقول و منقول و بافضیلت علمی طبع نظم و سلیقۂ انشائے عربی

و فارسی و نجوم و حساب و وقوف در نغمۂ ولایتی و ہندی بمرتبۂ کمال داشت قادری تخلص بود"

جس علمی و ادبی مجلس میں پہنچ جاتے، اپنی لیاقت اور فضیلت کا سکہ جما دیتے، ان کے زمانے میں شیخ احمدی فیاض انبیٹھی وال بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے، اکثر درسی کتابیں پڑھایا کرتے، ایک بار ملا صاحب ان سے ملنے گئے تو وہ شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے، ان کا ایک شاگرد ذیل کا ایک ہزلیہ قطعہ پڑھ رہا تھا:

ابو بکر الولد المنتجب   اراد الخروج لامر عجب
فقد قال انی عزمت الخروج   لکفارۃ ہی لی ام اب
فقلت الم تسمعن یا بنی   نہی النبی عن تلقی الجلب

اس قطعہ میں یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ لفظ کفتارہ ہے یا کفارہ جو کافری آیت میں مبالغہ کا صیغہ ہے، شیخ احمدی فیاض نے فرمایا معنی کے لحاظ سے کفارہ ہوگا، کفتارہ کا لفظ تو فارسی ہے، ملا صاحب بیچ میں بول اٹھے کفتارہ کو کفارہ سے کہیں زیادہ ترجیح ہے (ج ۳ ص ۸۴)

اکبری دربار میں شمس الدین حکیم الملک حکمت و طب میں جالینوس زماں اور مسیح دوراں سمجھے جاتے تھے، طب کے علاوہ علوم نقلی کے بھی عالم تھے، اپنے مذہبی عقیدہ میں بڑے راسخ رہے، ہمیشہ طالب علموں کو سبق پڑھاتے رہتے، ان کے اخراجات خود برداشت کرتے، ایک دن وہ شیخ سلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے علمی گفتگو کر رہے تھے، اثنائے گفتگو میں بو علی سینا کی خوبیاں بیان کرنے لگے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علماء اور حکماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی خاطر مجادلہ و مناقشہ کیا کرتے تھے،

ملا صاحب بھی وہاں پہنچ گئے، وہ کسی کو پہچانتے نہ تھے، بحث کے موضوع سے واقف ہوئے بغیر اس وقت انھوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ اشعار پڑھ دیے:۔

وکم قلت للقوم انتم علی　　شفا حفرة من کتاب الشفا
فلما استہانوا بتوبیخنا　　فزغنا الی اللہ حسبی کفا
فماتوا علی دین ارسطالیس　　وعشنا علیٰ ملۃ المصطفیٰ

(ہم نے کتنا کہا کہ تم لوگ کتاب الشفاء کی وجہ سے ہلاکت کے گڈھے کے کنارے ہو، لیکن جب وہ لوگ ہماری سرزنش کو حقیر سمجھے تو ہم نے یہ کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، یہ لوگ تو ارسطو کے دین کی طرف مائل ہو گئے اور ہم لوگوں نے ملت مصطفوی کی زندگی بسر کی)

مزید تائید کے لیے مولانا جامی کا یہ شعر پڑھ کر سنایا:

نور دل از سینۂ سینا مجوی　　روشنی از چشم نہ بینا مجوی

یہ تمام اشعار سن کر حکیم الملک گیلانی بہت برہم ہوئے، شیخ سلیمؒ نے ملا صاحب سے فرمایا "ان لوگوں میں پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی، تو نے آکر اور بھی بھڑکا دیا" (ج ۳ ص ۱۶۲-۱۶۱)

تعلیم کی فراغت کے بعد ملا صاحب نے کچھ دنوں اکبر کے ایک امیر محمد حسین خاں کے یہاں ملازمت کی جس کو کانت وگولہ (ضلع سہارنپور) کی جاگیر دی گئی تھی، یہاں انکے سپرد صدارت اور فقرا کی خدمت کی گئی، ایک روز وہ قنوج کے مضافات میں مکن پور حضرت شاہ مدار کی زیارت کے لیے گئے، وہاں کسی معشوق کے دام میں پھنس گئے اور بقول ان کے اس شہوت و آز کو عشق سمجھ بیٹھے، اس واقعہ کو یاد کر کے لکھتے ہیں کہ وہ بھی انسان تھے، انسان ہی کا کچا دودھ پیا تھا، غفلت جبلی سے بالاتر نہیں ہو سکے،

ان پر جہالت کا پردہ پڑ گیا، درگاہ میں جو بے ادبی ہوئی اس کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا، اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ بھی، ان کے معشوق کی قوم کے چند افراد نے ان پر حملہ کیا، اور تلوار سے ان کے سر، ہاتھ اور کندھے پر نو زخم لگائے، جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی، اس شکرانہ میں یہ اشعار لکھے ہیں:۔

القصہ ہر انچہ کرد گردون از جفا　　حق باید گفت بود دون حق ما
شکر از نعمتش نمی کرد ہیچ　　تا لاجرم فگند در رنج وبلا

اس مصیبت میں منت مانی کہ اچھے ہو کر حج کریں گے، لیکن پوری نہ کر سکے جس کا افسوس ان کو زندگی بھر رہا، اس سلسلہ میں احسان شناسی کے جذبہ میں اپنے آقا حسین خاں کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے باپ اور بھائی کی طرح ان کی خدمت کی، اور اس کے لیے برابر دعاگو رہے، اس کی مذہبیت، شجاعت، سخاوت، سادگی، انکسار اور بے نیازی کی بڑی تعریف اپنی تاریخ میں کی ہے (ج ۲ ص ۲۲۴، ۲۳۴ و ۱۳۷-۱۳۶)

ملا صاحب نے اپنے عشق کو جو ان کے خیال میں محض شہوت و آز تھا، جس بے تکلفی سے بیان کیا ہے، وہ ان کی صاف گوئی اور حق گوئی کی دلیل ہے، یہی انکی سیرت کا لازمی جزء بنا رہا۔

ملا صاحب حسین خاں کے یہاں تقریباً نو سال ملازم رہے، ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے، اس وابستگی کا حال اس طرح لکھتے ہیں:۔

"ماہ ذی الحجہ کے آخر میں یہ فقیر اپنی تقدیر سے جو تدبیر کے پاؤں کی زنجیر ہے حسین خاں کی ملازمت سے علحدہ ہو کر بدایوں سے آگرہ آیا، جہاں خاں قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلہ سے شاہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان دنوں علم کی بڑی قدردانی تھی، پہلی ہی دفعہ شہنشاہ سے تخاطب کا شرف حاصل ہوا، اور ہم نشینوں

میں داخل کر لیا گیا، علما اپنے تبحر کا ڈنکا بجاتے رہتے، کسی دوسرے کو نظر میں نہ لاتے، بحث و مباحثہ کر کے اپنے کو ممتاز دکھانے کی کوشش کرتے۔ خداوند تعالیٰ کی عنایت سے میں اپنی قوت طبع، ذکاوت فہم اور دلیری سے جو کہ جوانی کے زمانے کی لازمی چیزیں ہیں، ان میں اکثر پر غالب آ گیا، جب میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو شہنشاہ نے میری تعریف کی تھی کہ بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی سرکوبی کرے گا، شہنشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے، اس لیے میں نے بھی ان پر طرح طرح کے الزامات رکھے جن کو شہنشاہ نے پسند کیا، شیخ عبدالنبی صدرالصدور کے پاس میری رسائی نہ تھی، اس لیے وہ مجھ سے ناخوش رہے، مناظرہ کے وقت میرے فریق کی طرفداری کرتے اور یہ مثل صادق آئی کہ سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا، لیکن رفتہ رفتہ ان کی کلفت الفت میں بدل گئی، ان ہی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل بھی باریاب ہوا، اس کی دانش اور ہوشمندی کا ستارہ خوب چمک رہا تھا، اس لیے گوناگوں نوازشوں سے ممتاز ہوا۔" (منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۱۷۲-۷۳)

۹۸۲ھ (۱۵۷۴ء) کے جمادی الآخر میں اکبر جب قنوج میں مقیم تھا، تو اس نے ملا صاحب سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ فارسی میں کرنے کی فرمائش کی، انھوں نے اس کا ترجمہ کیا تو اکبر کو پسند آیا، اور اس کا نام خرد افزا رکھا گیا (ص ۱۸۳)۔ لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس ترجمہ کو اپنے شاہی طبیب حکیم الملک گیلانی کو پڑھنے کے لیے دیا، اور پھر پوچھا کہ اس کی تحریر و انشار کیسی ہے، تو انھوں نے کہا کہ اس کی عبارت تو فصیح ہے، لیکن پڑھنے میں کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی، (ص ۱۹۱، ج ۳)، پرکھوتم نامی ایک برہمن نے اس کی ایک شرح بھی لکھی (ج ۲، ص ۳۲۰)

۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) شاہی عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی۔ ملا صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

اس وقت تک اکبر کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہو چکی تھیں، اس کی سلطنت کے حدود میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی حکومت کا نظم و نسق اس کی مرضی کے مطابق ہوتا گیا اور جب ملک میں اس کا کوئی دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان عبادت و ریاضت کی طرف ہو گیا، اس کی صحبتیں اجمیر کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ رہنے لگیں، اس کا زیادہ تر وقت اللہ اور رسول کے تذکرہ میں گزرنے لگا۔ اس کی مجلسوں میں صوفیانہ یا فقہی اور علمی مباحث ہونے لگے، وہ رات کے وقت مراقبے میں بیٹھتا "یا ہو" یا ہادی کا وظیفہ بھی پڑھتا، جب عبادت خانہ کی تعمیر ہوئی، تو علما اور مشائخ اس میں اکثر علمی اور مذہبی مذاکرے کرتے، لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ اس عبادت خانہ میں سادات، مشائخ اور علما آپس میں جھگڑنے لگے، نشست کی تقدیم و تاخیر پر بھی لڑائی ہوئی۔ بالآخر بادشاہ نے سب کی جگہیں متعین کر دیں، پھر بھی ہنگامہ برپا رہتا، ایک رات بڑا شور و غل ہوا تو اکبر نے ملا صاحب سے کہا، جو شخص بھی نامعقول بات کہے اس کی اطلاع دو، اس کو اس مجلس سے اٹھا دیا جائے گا، یہ سن کر ملا صاحب نے کہا کہ اس طرح تو سب ہی کو اٹھوانا پڑے گا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲)

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو ہمایوں نے شیخ الاسلام بنایا تھا، لیکن ملا صاحب کا بیان ہے کہ وہ کنجوسی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیاداری کی وجہ سے ذلیل سمجھے جاتے، شیخ عبدالنبی صدرالصدور تھے، لیکن ان کے غرور و تکبر کی وجہ سے انکی کوئی عزت نہ تھی، ملا صاحب کا بیان ہے کہ ان ہی علما کی حرکتوں کو دیکھ کر وہ اسلام سے برگشتہ ہوتا گیا۔

اکبر ملا صاحب کی فضیلت، مذہبیت اور خوش گلوئی سے متاثر ہوا تو اس نے امامت کی خدمت

ان کے پیروکی اور اسی کے ساتھ بیستی کا عہدہ دینا چاہا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں :-

"بادشاہ نے مجھکو امام بنایا، اور حکم دیا کہ داغ کی خدمت بھی انجام دوں، اور کچھ خرچ دیکر فرمایا کہ بیستی عہدہ کے مطابق میں بھی گھوڑوں کا داغ کراؤں، اسی زمانہ میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں پہنچ گیا تھا، شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں، یہی حال میرا اور ابوالفضل کا تھا، لیکن وہ ہوشیار اور زمانہ ساز تھا، اس کو بھی جب بیستی کا عہدہ دیا گیا تو اس نے داغ اور محلہ کراکے اپنی ملازمت مضبوط کرلی اور منصب دوہزاری کے عہدہ اور وزارت تک پہنچ گیا، اس کے برعکس اس فقیر نے اپنی ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے اس نوکری کو قبول نہ کیا......

اور اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مدد معاش کے لیے کوئی آراضی وغیرہ عنایت ہوجاتی تو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر علمی خدمات میں مصروف رہے گا۔ (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۶)

۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) اکبر کے حکم سے ملا صاحب اتھربن کے ترجمے میں لگ گئے (ج ۲ ص ۲۱۲)۔ میں جہاد کے شوق میں رانا کیکا (رانا پرتاب) کے خلاف لڑنے کے لیے شاہی لشکر میں شریک ہوئے، (ج ۲ ص ۲۳۳) اور وہاں سے واپس ہوئے تو مان سنگھ کی طرف سے رانا کا نامور ہاتھی "رام پرشاد" لاکر اکبر کی خدمت میں پیش کیا، جس سے خوش ہوکر اکبر نے ان کو مٹھی بھر اشرفیاں انعام میں دیں، جو تعداد میں ۹۶ نکلیں (ج ۲ ص ۲۳۶)، اسی سال انھوں نے دیالپور میں اکبر کو کلام پاک کا ایک چھوٹا سا نسخہ اور وعظ و خطبہ کی ایک بیاض پیش کی (ج ۲ ص ۲۳۹)

۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں ملا صاحب نے دربار سے پانچ مہینے رخصت لیکر اپنے وطن بساور گئے، وہاں ایک سال رہ گئے، جس سے اکبر ان سے ایسا بدظن ہوا کہ ان کی طرف سے بے توجہ ہوتا چلا گیا جس کی کھٹک ملا صاحب زندگی بھر محسوس کرتے رہے۔ (ج ۲ ص ۲۵۳)

اسی اثنا میں ملا صاحب کا بیان ہے کہ عبادت خانہ میں علماء کی زبانوں کی چھریاں ایسی بے باکی سے چلنے لگیں کہ اکبر اسلام سے دور ہوتا چلا گیا، انھوں نے اکبر کے انحراف کا بڑا اچھا تجزیہ یہ لکھکر کیا ہے :-

درباری علماء میں کچھ اس طرف اور کچھ اس طرف ہوگئے، ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بنانے لگے، ان اختلافات کی وجہ سے اہل بدعت کو اپنے فاسد اور باطل خیالات کے ساتھ اپنے کمین گاہوں سے نکلنے کا موقع مل گیا، انھوں نے غلطیات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی، بادشاہ اخلاص کے ساتھ حق کا طالب تھا، لیکن ان پڑھ تھا، کافروں اور ادنی درجہ کے لوگوں سے محبت کرتا تھا، اس لیے ان مباحث کی وجہ سے شک میں پڑ گیا، اس کی حیرت بڑھتی گئی، اپنے اصلی مقصد سے پھر گیا، پھر تو اس کے سامنے سے شرع مبین اور دین متین کی مضبوط دیوار ٹوٹ گئی، پانچ چھ سال میں اسلام کا اثر باقی نہ رہا، سارا قضیہ الٹ کر رہ گیا، (ج ۲ ص ۲۵۵)

ملا صاحب نے اکبر کی بے دینی کا سارا الزام علماء کے باہمی اختلافات پر ڈال دیا ہے، وہ اقرار کرتے ہیں کہ اکبر شروع میں طلب حق کا سچا جذبہ رکھتا تھا، اس کی طبیعت میں تحقیق و تجسس تھا، ہر دین اور مذہب کے اعتقادات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا، لیکن اس کے بدعقیدہ مصاحبوں اور جھگڑالو علماء نے اس کا رخ پھیر دیا، علماء کا یہ فرض تھا کہ اس کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے۔ لیکن انھوں نے اپنے اعزاز و رتبہ کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنا شروع کیا، ایک ہی مسئلہ کو علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا، بادشاہ ان باتوں سے دل برداشتہ ہوتا چلا گیا، دربار میں مختلف مذاہب اور مسالک کے گمراہ کن

عناصر موجود تھے، انھوں نے علماء کے ان اختلافات سے فائدہ اٹھایا، اور دین کے معتقدات
کو خلافِ عقل ثابت کرکے اکبر کے ذہن کو انکار اور انحراف کی طرف مائل کردیا۔ (ج ۲ ص ۲۵۶)
اکبر نے پھر جو مذہبی وطیرہ اختیار کیا، اس کو ملا صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے،
اور یہ صرف ان ہی کی تاریخ منتخب التواریخ میں ملتی ہے، اس کو مختصر طریقہ پر اس طرح
درج کیا جاسکتا ہے:

بادشاہ کا خیال ہوگیا تھا کہ حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے (ج ۲ ص ۲۵۶)
وہ عقیدۂ تناسخ کا قائل ہوگیا (ج ۲ ص ۲۵۸) شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا نے وحدت الوجود
کی روشنی میں اس کو انسان کامل کا درجہ دیدیا، جس کے بعد اس کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا،
اور اس کا نام زمین بوس رکھا گیا، چہرۂ شاہی کو کعبۂ مرادات اور قبلۂ حاجات قرار دیا گیا،
(ج ۲ ص ۲۵۹) بیربر کے اثر سے دربار میں آفتاب پرستی کا بھی فروغ ہوا، اور آفتاب کو
مظہر کامل، سرچشمۂ سعادت، نیر اعظم، عطیہ بخش ہمہ عالم بتایا گیا (ج ۲ ص ۲۶۰) نوروز جلالی
کی تنظیم اہتمام سے کی جانے لگی، گائے کا ذبیحہ بھی بند کردیا گیا، اس کا گوبر پاک سمجھا جانے لگا،
گائے کا گوشت کھانا حرام ہوگیا، گاؤکشی کی سزا قتل قرار دی گئی، محل کے اندر یہ سمجھ کر
آتشکدہ بنایا گیا کہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اور اس کے انوار
کا ایک پرتو ہے۔ اکبر آفتاب کے ساتھ آگ کو سجدہ کرنے لگا۔ وہ پیشانی پر قشقہ لگاکر
دربار میں آنے لگا، راکھی بھی بندھوانی شروع کردی، وغیرہ وغیرہ (ج ۲ ص ۲۶۱-۲۶۲)

پھر اکبر کے حقِ اجتہاد کے لیے ایک محضر تیار کیا گیا جس کے مطابق اس کو امام عادل
قرار دے کر یہ حق دیا گیا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح
دے کر اس کے مطابق فیصلہ کرسکتا ہے، اس محضر کو شیخ مبارک ناگوری نے مرتب کیا،

ملا صاحب کے بیان کے مطابق اور علماء نے کراہت کے ساتھ اس پر دستخط کیے، اس کے
بعد کسی کو اکبر کی مخالفت کی مجال نہیں رہی، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اکبر کی جسارتیں بڑھ
گئیں، اس نے قرآن کو مخلوق قرار دیدیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے
بارے میں شکوک کا اظہار کیا، فرشتوں، معجزوں اور کرامتوں وغیرہ کا منکر ہوگیا،
مرنے کے بعد بقاے ارواح اور عذاب و ثواب کو تناسخ پر منحصر کردیا (ج ۲ ص ۲۷۰-۲۷۱)
ملا صاحب نے شاید خود ہی اس بے راہ روی کی تاریخ "فتنہ ہائے امت" سے نکالی، لیکن
تعجب کی بات ہے کہ اس بے دین بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر پھر ملازمت کرلی جب
وہ اس کے پاس آئے تو اس نے ان سے پوچھا کہ کیا ضعف تھا کہ ملازمت ترک کردی"
ان کے بجائے ایک درباری امیر غازی خاں بدخشی نے برجستہ کہا "قسمت کا ضعف تھا"
جب وہ شاہی ملازمت سے دوبارہ وابستہ ہوگئے تو ان کی جاگیر بھی بحال ہوگئی (ج ۲ ص ۲۰۴-۲۰۵)
مگر دربار سے وابستگی کے بعد اکبر کی بے دینی سے ان کا دل کڑھتا رہا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دربار کے
کمینے، ذلیل اور عالم نما جاہل علماء نے اکبر کو باور کرایا کہ وہ اس عہد کے صاحب زمان ہیں"
اور بعض کتابوں سے یہ شہادت پیش کی ۹۹۰ھ میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور
ہوگا، اور صاحب دین حق کے کلمہ کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں، اس کی مصداق
صرف بادشاہ کی ذات ہے (ج ۲ ص ۲۸۰) ملا صاحب کے بیان کے مطابق اکبر نے اپنے
اٹھائیسویں سال جلوس میں یہ اعلان کیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی بعثت سے پورے ہزار سال
ہوچکے ہیں، آپ کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہوچکی ہے، اس لیے وقت آگیا ہے کہ
ایک نئے دین کا اعلان کیا جائے (ج ۲ ص ۳۰۱)

اس اعلان کے بعد ملا صاحب کے بیان کے مطابق جو احکام جاری کیے گئے ان میں کچھ یہ ہیں:

سکہ پر الفی تاریخ ثبت کیا جائے، اور یہ ہزار سنہ رسول اللہؐ کی رحلت سے شروع کیا جائے (ج ۲ ص ۳۰۱) بادشاہ کو سجدہ کرنا لازم ہے، شراب جسمانی صحت کی خاطر پی جا سکتی ہے، خاص خاص شرائط کے ساتھ طوائفوں کے یہاں جانے کی اجازت دیدی گئی، (ج ۲ ص ۳۰۲) گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کر دی گئی، داڑھی منڈانے کا عام رواج ہو گیا، ڈاڑھی کی مذمت کی گئی، دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی (ج ۲ ص ۳۰۲) جو کوئی اس دین کو قبول کرتا، اس کو اقرار کرنا پڑتا، کہ اپنے باپ دادا کے مجازی اور تقلیدی اسلام سے انکار کرتا ہوں، اور دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اخلاص کے چار گانہ مراتب یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں (ج ۲ ص ۳۰۴) احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دیدیا گیا، غسل جنابت ضروری نہ سمجھا گیا (ج ۲ ص ۳۰۵) موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا کھلانا بے معنی قرار دیا گیا، اس کے بجائے ولادت کے روز کھانا پکوا کر دعوت کرنے کی ہدایت دی گئی، اور اس کا نام آش حیات رکھا گیا (ج ۲ ص ۳۰۵-۶) شیر اور جنگلی سور کا گوشت حلال کر دیا گیا، چچا، ماموں، اور قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کر دیا گیا، سونا اور ریشمی کپڑے جائز قرار دیے گئے، یہاں تک لکھتے لکھتے ملا صاحب کو غصہ آ گیا ہے اور لکھتے ہیں کہ بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے نماز، روزہ اور حج کی مذمت اور تمسخر میں کئی رسالے لکھے، جو بادشاہ کی نظر میں مقبول ہوئے،

نماز، روزہ و حج خود پیش ازاں ساقط شدہ بود، بعضی اولاد الزنا چوں پسر ملا مبارک و شاگرد رشید شیخ ابوالفضل رسائل درباب قدح و تمسخر ایں عبادات بدلائل نوشتہ مقبول افتادہ باعث تربیت گشت (ج ۲ ص ۳۰۶)

عربی کا سنہ ہجری موقوف کر دیا گیا، اسکی جگہ بادشاہ کے سنہ جلوس کی تاریخ لکھی جانے لگی،

عربی پڑھنا عیب ہو گیا، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون ہونے لگے، وغیرہ وغیرہ (ج ۲ ص ۳۰۶)

شاہی دربار کا جب یہ رنگ ہو گیا تو ملا صاحب اس سے بد دل ہوئے، اپنی بددلی اور آزردگی کا حال اس طرح قلمبند کرتے ہیں:-

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو فقیر گوشۂ عزلت میں بیٹھ گیا

اذ عظم المطلوب قل المتاعب

یعنی جب خواہشات بڑی ہو جاتی ہیں تو مشکلات بڑھ جاتی ہیں،

میں فرار کی آیت کو پڑھتا، بادشاہ کی نظر سے گر گیا، ان کی آشنائی بیگانگی میں تبدیل ہو گئی، لیکن الحمد للہ کہ میں اس حال میں خوش ہوں،

دل در رنگ و بو نشد نیکو شد کہ نشد — جز در تو فرو نشد نیکو شد کہ نشد
گفتی کہ برنجم از نیکو شد کارت — دیدی کہ نیکو نشد نیکو شد کہ نشد

اپنے کو نہ بادشاہ کی رعایت کے قابل اور نہ انکی خدمت کے لائق سمجھتا تھا،

با تا تکلف بہ یک سو نہیم — نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی کبھی صف نعال سے کورنش بجا لاتا، اور اہل محفل کا تماشا دیکھ لیتا

کہ صحبت بر نیاید تا موافق نیست مشربہا

اور اس کے بعد یہ حال تھا

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است — صحبت گذاشتم ز تماشائیاں شدم

پھر اوپر دین الٰہی کی جو تصویر کھینچی ہے، اس کے بارہ میں اسی سلسلہ میں کہہ گئے ہیں کہ حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں ان حالات کو نہ لکھتا، لیکن خدائے عزوجل گواہ ہے، اور اس کا گواہ ہونا کافی ہے کہ میرے ان باتوں کے لکھنے کا مقصد

صرف اس دین کے ساتھ درد اور ملت مرحوم اسلام کے ساتھ دل سوزی کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے، جو عنقا کی طرح کوہ قاف میں اجنبی بن گیا ہے، اور اسکے بازو کا سایہ اس دنیا کے خاک نشینوں پر سے جاتا رہا ہے، میں تو خدا کی قسم ملامت، نفرت، حسد اور تعصب سے پناہ مانگتا ہوں (ج ۲ ص ۶۴ - ۲۶۳)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: (ج ۲ ص ۲۷۹)

میں نے ہر چند چاہا کہ میں صرف تاریخی واقعات کو قلمبند کروں، لیکن میرا قلم بے اختیار ہو کر دوسری طرف بھاگ جاتا ہے، اور اس نئے مذہب اور نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے، ..... کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا ......

خطابی با فلک کردم از تیغ جفا کشتی — ستمہان مجلس آرائی و جواں مردان گرگ را
زمام حل و عقد خود نہادی در کف قومی — کہ از روی کرم برانیشان شرف سگ را
جہاں در گوش جانم گفت فاسغ باش خوش بیزی — کہ سلطت برکند ایام ہر دہ روز ملکیک را

ملا صاحب کی اصلی خواہش یہ رہی کہ ان کو مدد معاش کے طور پر کوئی جاگیر مل جاتی تو وہ نوکری نہ کرتے بلکہ توکل و قناعت کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علمی کاموں میں لگے رہتے، (ج ۲ ص ۷۴، ۲ و ۲۰۶) لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی، مجبوراً ملازمت کر لیتے پھر جس کے بدلے میں ان کو جاگیر ملتی رہتی (ج ۲ ص ۳۴۲) میر سید محمد میر عدل امروہی کے ذکر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ موروثی تعلقات اور قدیم شفقت کی بنا پر وہ مجھ پر بڑے مہربان تھے، میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں برابر کہا کرتے تھے مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو، صدور کی خوشامد کی ذلت نہ اٹھاؤ، بادشاہی ملازمت میں داخل ہو کر داغ کرا لو، کیونکہ شاہی ملازمین میں بڑی انانیت اور فرعونیت ہوتی ہے:

میں نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی، اس لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا نہ کرے کسی اور کو دیکھنا نصیب ہو (ج ۳ ص ۷۶ - ۷۵). مدد معاش کے نہ ملنے کی وجہ سے گوشہ نشین نہ ہو سکے، لیکن ملازمت کر کے کڑھتے بھی رہے، ان کو ایک موقع پر اجمیر کی تولیت ملنے والی تھی لیکن نہ ملی، اسی سلسلہ میں وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سلسلہ کی ایک اولاد شیخ حسین کی ریاضت، عبادت، مجاہدہ، توکل و قناعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی بزرگی کے طفیل میں ان کو شاہی ملازمت سے رہائی مل جاتی، تو شاید (دربار کی) لایعنی گفتاری، پریشان گوئی، بیہودگی، اور دروغ نویسی سے نجات پا جاتے، اور وطن جا کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ اور بقیہ عمر مفید کاموں میں صرف کرتے (ج ۲ ص ۹۰ - ۸۹)، لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، اور وہ شاہی ملازمت سے وابستہ رہے۔

پہلے ذکر آیا ہے کہ ملا صاحب ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں پانچ مہینے کی رخصت پر گئے تو ایک سال تک واپس نہیں ہوئے، ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں دربار میں حاضر ہوئے، تو اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جب بادشاہ اجمیر کی حاضری کے بعد فتح پور واپس ہو رہے تھے، تو انھوں نے تودہ کے مقام پر حاضر ہو کر اپنی ایک کتاب چہل حدیث پیش کی، جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں تھیں، اس کا نام بھی تاریخی تھا، بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانہ میں داخل کر لی، اور رخصت میں وعدہ خلافی کی تقصیر کا کوئی ذکر نہیں کیا، (ج ۲ ص ۵۵ - ۲۵۴)

انھوں نے ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں اکبر کے حکم سے تاریخ الفی کی تدوین میں شرکت کی (ج ۲ ص ۳۱۸ - ۱۹) ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں مہابھارت کے فارسی ترجمہ کرنے

میں بھی شریک ہوئے (ج ۳ ص ۱۱۸) ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) میں اکبر ہی کے حکم سے رامائن کا ترجمہ کرنا شروع کیا، جو ۹۹۶ھ (۱۵۸۷ء) میں ختم ہوا (ج ۲ ص ۳۳۶-۳۶۶) ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں اکبر ہی کی فرمائش پر تاریخ کشمیر مترجمہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی کی زبان کو سلیس کر کے اس کا ایک انتخاب تیار کیا (ج ۲ ص ۳۷۴) ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں شاہی حکم کے مطابق معجم البلدان کے دس جزء کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا (ج ۲ ص ۳۷۵)، ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا، تو دربار سے پانچ مہینے کی رخصت لی، اس سلسلے میں لکھتے ہیں:-

"مجھکو پانچ مہینے کی رخصت ملی، مرزا نظام الدین احمد نے بادشاہ کی خدمت میں میری طرف سے عرض کیا کہ میری والدہ دنیا سے کوچ کر گئی ہیں، میں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کو تسلی دلاسا دینے کے لیے رخصت چاہتا ہوں، بادشاہ نے خفگی کے ساتھ یہ رخصت دی، اس موقع پر صدر جہاں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو، لیکن میں نے نہیں کیا، بادشاہ نے صرف اتنا کہا کہ گذاردینی جانے دو، لیکن رنجیدہ ہو کر مجھکو سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا، میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا، اور وہاں جا کر بیمار پڑ گیا۔" (ج ۲ ص ۳۷۶)

ملا صاحب کے اسی انا سے ان کی سیرت کی بلندی کا اظہار ہوتا ہے، وہ اپنی خودداری، اپنے علم اور اپنی عالمانہ شان کو شاہی دربار میں گروی رکھ دیتے تو ان کو بھی وہی درباری عزت اور دنیاوی وجاہت و ثروت مل سکتی تھی، جو ان کے معاصر درباری علما کو ملی، لیکن ان چیزوں کے لیے اپنے انا کو کبھی قربان کرنا پسند نہیں کیا،

وہ وطن گئے تو وقت پر واپس نہ آ سکے، اسی اثنا میں شاہی کتب خانہ سے سنگھاسن بتیسی

کے ان کے فارسی ترجمہ کا نسخہ خرد افزا گم ہو گیا، اس سلسلہ میں ان کو بار بار دربار میں طلب کیا گیا، پھر بھی حاضر نہ ہو سکے، لکھتے ہیں:-

"شاہی کتب خانہ سے نامۂ خرد افزا کا نسخہ گم ہو گیا، حلیمہ سلطان بیگم نے چند بار بدایوں قاصد بھیجکر طلب کیا، لیکن کچھ ایسے موانع تھے کہ جا نہ سکا، آخر حکم ہوا کہ میری مدد معاش موقوف کر دیجائے، اور میری مرضی کے خلاف مجھکو طلب کر لیا جائے، اس موقع پر مرزا نظام احمد (خدا ان کو غریق رحمت کرے) نے دوستی کا پورا حق ادا کیا، شیخ ابوالفضل نے بھی بار بار بادشاہ سے کہا کہ کوئی نہ کوئی موانع ضرور درپیش ہیں جن سے میں نہیں آ سکا ہوں اور وہاں رہ گیا ہوں (ج ۲ ص ۳۷۷)

اس موقع پر فیضی نے بھی دکن سے بادشاہ کو ملا صاحب کی تائید میں پرزور خط لکھا، جس کا اثر اکبر پر بھی ہوا، ان سفارشات کے بعد ملا صاحب پھر دربار سے وابستہ ہو گئے، اور ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں جامع رشیدی کے ترجمے میں شریک ہوئے، اور ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں بحر الاسمار کا ترجمہ مکمل کیا، جس کے صلہ میں اکبر نے ان کو دس ہزار ٹنکے اور ایک گھوڑا انعام میں دیا (ج ۲ ص ۴۰۱-۴۰۲)، وہ برابر اپنی علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے، ان کی ایک اور تصنیف نجات الرشید ہے، جس میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی تفصیل ہے (ج ۲ ص ۴۰۰) یہ کتاب انھوں نے مرزا نظام الدین احمد بخشی مؤلف طبقات اکبری کی فرمائش پر لکھی، اس کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ

"این تالیف سبب نجات بر رشید و رشد بر طالب مزید گردد۔"

ملا صاحب کے تراجم تو زیادہ تر اکبر کے شاہی کتب خانہ کے لیے زینت بن کر رہ گئے، لیکن ان کی جو تصنیف سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ ان کی منتخب التواریخ ہے،

یہ انھوں نے گوشۂ عزلت میں بیٹھکر اپنی مرضی کے مطابق لکھی، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے میں اکبر سے قبل کے سلاطین ہند کی تاریخ ہے، دوسرے میں اکبری عہد کے سارے واقعات ہیں، تیسرے میں اس عہد کے علما، مشائخ، اطبا اور شعرا کا ذکر ہے۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ ملا صاحب نے خدا کی قسم کھاکر اعلان کیا ہے کہ انھوں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ملامت، نفرت، حسد اور تعصب کا جذبہ نہیں ہے، وہ اس کتاب کے خاتمہ پر بھی لکھتے ہیں کہ ان کے سودائی قلم نے ان کے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے، ان کا یہ جنون شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی حمایت میں ظاہر ہوا ہے، ان کو دکھ تھا کہ اسلام کے احکام میں ایسے تغیرات کیے گئے جس کی مثال گذشتہ ہزار سال میں نہیں ملتی، پھر اس زمانہ کے تمام کفریات اور حشویات کو مستحسنات قرار دیکر خوشامد یا دین کی ناواقفیت یا حق پوشی کی بنا پر املا اور انشا کر دیے گئے ہیں، یہ غالباً ابوالفضل کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے ملا صاحب نے اپنے مشاہدات قلمبند کرنے شروع کر دیے، تاکہ آیندہ لوگ خرافات باطل اور تطویلات لاطائل پڑھ کر تذبذب میں مبتلا نہ ہو جائیں، لکھتے ہیں کہ اور ارباب تصنیف و تالیف تقرب ملوک، استجلاب منافع اور تحصیل مقاصد کی خاطر قلم چلاتے رہے، یہ بھی شاید ابوالفضل ہی پر چوٹ ہے، اس کے بعد کہتے ہیں کہ وہ طمع اور توقع سے بالاتر ہو کر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتے ہیں، تاکہ لوگ اس زمانہ کے حالات و حقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں،

اگر شراب خوری جرعہ فشان بر خاک ‌ ‌ ازاں گناہ کہ نفعے رسد بغیر چہ باک

اس کتاب کو لکھتے وقت ان کو ڈر تھا کہ ان کے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو

انھوں نے دوسرے کے ساتھ کیا، (ج ۳ ص ۹۴-۳۹۲)۔ ان کا یہ ڈر صحیح ثابت ہوا، موجودہ دور میں ان پر طرح طرح کے اعتراضات کیے جاتے ہیں،

ان پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انھوں نے اکبر کی بہت بری تصویر پیش کرکے اسکی سطوت شکنی کی ہے، اور ان کو خود اس کا احساس رہا، اسی لیے اپنی زندگی میں اس کی اشاعت نہ کرا سکے، جہانگیر نے بھی اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی تھی، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اسی کتاب میں جب وہ اکبر کی سیاسی اور حربی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی شاہانہ سطوت کو برقرار رکھتے ہیں، کہیں اس کی عظمت میں فرق نہیں آنے دیتے، جب جب وہ اس کے یہاں باریاب ہوئے، اس کے ذکر میں بھی شاہانہ آداب کا لحاظ رکھا ہے، البتہ اس کے مذہبی عقائد میں ان کا قلم شمشیر برہنہ ہو گیا ہے، اور پھر اکبر ہی پر کیا منحصر وہ تو علما میں بھی نقص دیکھتے تو ان کے لیے بھی سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے رہے، مثلاً شیخ الاسلام عبد اللہ سلطانپوری کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتے کہ ہر سال کے خاتمہ پر اپنا سارا مال بیوی کے نام کر دیتے، اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام واپس لے لیتے، وہ تو ایسے ایسے فریب کرتے کہ بنی موسیٰ یعنی بنی اسرائیل بھی سنکر شرمندہ ہو جاتے، ان کی خست، رذالت، خباثت، مکاری، دنیا داری اور ستمگاری کے بہت سے قصے مشہور ہیں، جو زیادہ تر انھوں نے پنجاب کے علما، فقرا اور ائمہ کے ساتھ دکھائیں، یہ سب ایک ایک کرکے ظاہر ہونے لگیں، کیونکہ ایک دن راز ظاہر ہی ہو جاتا ہے، پھر تو زبانیں کھل گئیں، ان کی اہانت، استخفاف اور مذمت میں ایک سے ایک قصے سنائے جانے لگے۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

لیکن اسی کے ساتھ وہ عبد اللہ سلطانپوری کے فضائل کے بھی معترف تھے، اپنی

کتاب کی تیسری جلد میں علماء کے تذکرے میں ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے منفرد اور یگانۂ روزگار عالم تھے، عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور علوم نقلی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں، جن میں **عصمۃ انبیاء** اور **شرح شمائل النبی** بہت مشہور ہیں ...... شریعت کے پھیلانے میں ہمیشہ کوشاں رہے، (ج ۳ ص ۷۰)۔ اسی طرح صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی تصویر تو ایک طرف اس طرح کھینچتے ہیں کہ جس وقت وہ اپنی مسند جاہ و جلال پر بیٹھ جاتے تو بڑے بڑے امراء اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے ان کے پاس آتے، وہ ان کی بہت کم تعظیم کرتے، اور جب وہ حد سے زیادہ الحاح و عاجزی کرتے تو ان مدرسوں کو جو ہدایہ اور دوسری منتہی کتابیں پڑھا سکتے تھے، تقریباً سو بگھے کی اراضی منظور کرتے، باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض ہوتے، قلمزد کر دیتے، اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ ہندوؤں کو اچھی اچھی زمینیں عطا کر دیتے تھے، اس طرح ان کی بدولت علم اور علماء دونوں کی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی، وہ اپنے دفتر میں دوپہر کے بعد نہایت غرور سے بیٹھ کر وضو کرتے تو مستعمل پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور مقربوں کے سروں اور کپڑوں پر گرتے رہتے، مگر ان کو ذرہ برابر اس کی پرواہ نہ ہوتی (ج ۲ ص ۲۰۵)۔ دوسری طرف انکے بارہ میں یہ بھی لکھ کر ان کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے کہ وہ شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے تھے، چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ جا کر حدیث کا علم پڑھا، وہاں سے واپس آئے تو اپنے آباء و اجداد کی روش کے مطابق سماع اور غناء کے منکر رہے، اور محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے، تقوی، طہارت، پاکبازی اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، جب منصب صدارت کو پہنچے تو ہر جگہ مدد معاش میں زمین دی، وظائف مقرر کیے، اوقاف قائم کیے، کسی اور بادشاہ

کے زمانہ میں ایسا صدر نہ ہوا ہوگا، انھوں نے جتنے اوقاف قائم کیے کسی اور صدر نے اس کا دسواں حصہ بھی نہ کیا ہوگا (ج ۳ ص ۸۰-۹۰) لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعد میں ان کا طرز عمل بدل گیا،

شریف آملی کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مردود مطرود پاؤں جلے کتے کی طرح ایک دیار سے دوسرے دیار میں مارا پھرتا، ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا، سب سے جھگڑتا، یہاں تک کہ اس نے الحاد کا راستہ اختیار کیا، کچھ عرصہ صوفیوں کے بھیس میں بلخ جا کر مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں جو کہ شیخ حسین خوارزمی قدس اللہ سرہ کے پوتے تھے، درویشوں کے ساتھ رہا، درویشی سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا، اس لیے وہ درویشوں کے ساتھ ہرزہ سرائی اور بیکار قسم کی نوک جھونک کرتا رہتا، پریشان ہو کر لوگوں نے اس کو خانقاہ سے نکال دیا، اس کے لیے یہ شعر کہا گیا،

ہست یک ملحدے شریف بنام ناتمامی بطور خویش تمام

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ گھومتا پھرتا مالوہ پہنچا، اور اپنے کو دسویں صدی کا مجدد اعلان کرایا، اکبر کے دربار میں حاضر ہوا، تو اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، اکبر اس سے خلوت میں باتیں کرتا، اس نے اپنے مہملات کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا تھا، اور اس کا نام ترشح ظہور رکھا تھا، ملا صاحب لکھتے ہیں کہ اپنی اس مکاری کے باوجود اپنی فضیلت کا سکہ جما رکھا تھا اور ہزاری منصب تک پہنچ گیا، اور بنگالہ میں مذہب حق کا داعی مقرر ہوا، بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے بادشاہ کی نیابت بھی کرتا ہے۔ (ج ۲ ص ۲۸۲)

بعض حلقوں میں ان کی راسخ العقیدگی کو ان کے مذہبی تعصب اور غلو پر محمول کیا جاتا ہے۔

لیکن ان کی تصانیف میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ انھوں نے شیعوں اور ہندوؤں کی تعریف دل کھول کر کی ہے، خانخانان بیرم خاں کی فیاضی، علم پروری اور عبادت گذاری کی تعریف میں ان کا قلم خوب چلا ہے، اور جب اس کو ہلاک کیا گیا تو ملا صاحب اسکو شہادت کا درجہ دیتے ہیں، کیونکہ وہ عازم حج تھا، کسی نے اس کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکالی تھی:

گفتا کہ شہید شد بیرام

ملا صاحب نے یہ تاریخ قلمبند کرکے لکھا ہے کہ انھوں نے خود یہ تاریخ نکالی

گفت گل گلشن خوبی نماند (ج ۲ ص ۴۶)

ملا صاحب اکبر کے معزز امیر فتح اللہ شیرازی کی دنیاداری اور امراپسندی کو پسند نہ کرتے تھے، لیکن ان کو اعلم العلمائے زماں تسلیم کرتے ہیں (ج ۳ ص ۱۵۴)، انکے بارہ میں لکھتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھاتے رہتے، دیوان خانہ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک کے مطابق نماز پڑھا کرتے تھے، بادشاہ ان کو تقلید پرست سمجھتا، لیکن ان کے علم و حکمت کا خیال کرکے چشم پوشی سے کام لیتا، پھر لکھتے ہیں کہ جب وہ وزارت کے عہدہ پر راجہ ٹوڈرمل کے شریک کار بنا دیے گئے تو نہایت دلیری کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کرکے وزارت کے فرائض بجالاتے تھے، ملا صاحب ان فضائل سے متاثر ہو کر یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ جب وہ دربار میں آئے تو ان کی آمد کی تاریخ "شاہ فتح اللہ امام اولیاء" سے نکالی گئی، (ج ۲ ص ۳۱۶)۔ اپنی تیسری جلد میں قاضی نوراللہ شستری کی مدح تو ایسی کی ہے جس سے زیادہ ان کا انتہائی درجہ کا عقیدت مند بھی نہیں

کر سکتا ہے، لکھتے ہیں کہ وہ مذہباً شیعہ تھے، بہت ہی منصف مزاج، عادل، نیک نفس، حیادار، متقی اور عفیف تھے، ان میں شرفا کی تمام خوبیاں تھیں، علم، حلم، جودت فہم، وجدت طبع صفائی قلب اور ذکاوت وغیرہ کے لیے مشہور رہے، ان کی اچھی اچھی تصانیف بھی ہیں، شیخ فیضی کی مہمل غیر منقوط تفسیر پر انھوں نے جو تقریظ یعنی سرنامہ لکھا ہے وہ تعریف سے باہر ہے، شعر گوئی کا بھی ذوق تھا، اور دلنشین اشعار کہتے، حکیم ابوالفتح کے وسیلے سے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے...... انھوں نے اپنی قضاۃ کے زمانے میں لاہور کے شرارت پسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے، درست کر دیا، رشوت کی ساری راہیں بند کرا دیں، اس سے بہتر اور انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا، ان کے متعلق یہ شعر صادق آتا ہے (ج ۳ ص ۱۳۷-۱۳۸)

در قضا ہیچ زکس جز کہ شہادت زگواہ — توئی آں کس کہ نکردی ہمہ عمر قبول

ہندوؤں میں ملا صاحب راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بیربر سے خوش نہیں تھے، راجہ بیربر کے لیے تو وہ بہت ہی سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اچھے ہندوؤں کی تعریف میں ان کی تحریر شگفتہ ہوگئی ہے، جو راگڈھ کے راجہ رام چند کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی ہمت اور اخلاق میں اپنی مثال نہیں رکھتا تھا، اس کی بخششوں کا یہ حال تھا کہ ایک کروڑ روپے ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا، ابراہیم سور کو تو بہت کچھ شاہانہ ساز وسامان دیا، تان سین اس سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا، لیکن جلال خاں قورچی وعدے وعید کرکے اس کو شاہی دربار میں اپنے ساتھ لے آیا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب رام چند رشاہی دربار میں آیا تو اس نے ایک سو بیس (۱۲۰) قیمتی لعل وجواہر نذرانے میں دیے، ان کی قیمت پچاس (۵۰) ہزار روپے ہوتی تھی۔ (ج ۲ ص ۳۳۵)

وہ راجہ مان سنگھ کی خوبیوں کے بھی معترف رہے۔ اس کے کارناموں کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے، جب وہ رانا پرتاپ کے خلاف شاہی لشکر لیکر گیا تو جس بہادری سے وہ لڑا اسکے متعلق لکھتے ہیں کہ اس نے ایسی ثابت قدمی دکھائی کہ جو تصور میں نہیں آسکتی ہے (ج ۲ ص ۲۳۳) اسکی حق گوئی اور سیرت کی بلندی کی تعریف یہ لکھ کر کی ہے کہ ایک رات بادشاہ نے اس کو اپنے خلوت میں بلاکر اپنے دین کی ترغیب دلائی، لیکن اس نے بڑی بے باکی سے یہ جواب دیا کہ اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو ہم تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہر وقت حاضر رہتے ہیں، آزمانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور منشا ہے تو اس کا تعلق مذہب سے ہے۔ میں اعتقاداً ہندو ہوں۔ اگر حکم ہو تو مسلمان ہو جاؤں، ان دو کے علاوہ کوئی اور تیسرا راستہ نہیں جانتا (ج ۲ ص ۳۴۴)

وہ راجہ مان سنگھ کے باپ راجہ بھگونت سنگھ کی حق گوئی کے بھی معترف تھے، اکبر جب اپنے نئے دین کے اجراء کے فکر میں تھا تو ایک روز راجہ بھگونت سنگھ نے بڑھکر اس سے کہا کہ میں قبول کرتا ہوں کہ ہندو بھی برے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن یہ فرمائیے کہ کون سا گروہ بہتر ہے، جس کو ہم سب لوگ قبول کرلیں"۔ ملا صاحب کا بیان ہے کہ بھگونت داس کی اس بات کو سن کر اکبر کی شدت کچھ دنوں کے لیے کم ہوگئی لیکن پھر اسلام کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اسکی تاریخ "احداث بدعت" سے نکالی گئی۔ (ج ۲ ص ۲۱۳)

(باقی)

بزم تیموریہ

بکثرت اضافوں کے ساتھ زیر طبع (مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن)

مینجر

بدایۃ المجتہد ابن رشد

از جناب مولوی عبدالعظیم صاحب اصلاحی

ابن رشد جس درجہ کا فلسفی تھا، اسی درجہ کا فقیہ و مجتہد بھی تھا لیکن اس کی فلسفیانہ شہرت نے اس کی فقہی حیثیت کو بالکل دبا دیا، اس مضمون میں اسکی اسی حیثیت کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے تفقہ اور اجتہاد پر مورخین متفق ہیں، اسکے سوانح نگار مولانا محمد یونس مرحوم لکھتے ہیں:

"ابن رشد نے حدیث و فقہ کی تعلیم جن اساتذۂ فن سے حاصل کی تھی، ان کا مرتبہ اجتہادی اس کی شہادت ہے کہ ابن رشد کا کمال فقہی اپنے ہم عصروں میں بہت زیادہ ممتاز حیثیت رکھتا تھا، دنیا سمجھتی ہے کہ ابن رشد محض ارسطو کا مقلد تھا، اسکا سوانح نگار ابن الابار کہتا ہے کہ فلسفہ وغیرہ کو نظر انداز کرکے کم از کم فقہ میں تو اس کا کوئی نظیر نہ تھا"[1]

ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے:-

اوحد فی علم الفقہ والخلاف[2]	وہ علم فقہ اور خلافیات میں یکتا تھے،

سلیم خوری اور سلیم شہادہ لکھتے ہیں:-

اوحد آحاد عہدہ ذکاء	وہ ذکاوت اور علم و اجتہاد میں اپنے
وعلماء اجتہاداً[3]	عہد میں یکتا تھے۔

ابن رشد کا فرانسیسی سوانح نگار رینان لکھتا ہے کہ

---

[1] ابن رشد مولانا یونس مرحوم [2] طبقات الاطباء ص ۵، [3] آثار الازہار ص ۲۲۱

"جس قدر اس (ابن رشد) کو فلسفہ اور طب میں عبور تھا، اس سے کم فقہ میں نہ تھا، ابن الابار فقہ میں اسکے کارناموں پر زیادہ زور دیتا ہے، اور بمقابلہ ان تصنیفات کے جو فلسفہ ارسطو پر اس نے لکھیں اور جو اس کی شہرت کا باعث ہوئیں، اس کے تبحر فقہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اور ابن سعید فقہائے اندلس کی سب سے اگلی صف میں اس کو جگہ دیتا ہے، جن علماء سے اس نے علوم فقہیہ و طبیہ حاصل کیے وہ اپنے زمانہ کے بڑے لوگوں میں گذرے ہیں۔"[1]

اس کے تفقہ اور اجتہاد کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں قاضی القضاۃ کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا، علامہ شبلی حکمائے اسلام کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

"عبد المومن نے ۵۴۸ھ میں جبکہ ابن رشد کی کل عمر ستائیس برس کی تھی، وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا، یعنی اندلس سے لیکر مراکو تک کے کل علاقے اس کے قضا کے حدود میں آگئے"[2]

زمانروائے مراکش عبد المومن کے بعد اس کے چھوٹے بھائی یوسف نے اس کو اشبیلیہ کا قاضی القضاۃ بنایا۔[3]

یوسف کے بعد اس کے جانشین یعقوب منصور نے ابن رشد کی سب سے زیادہ قدر دانی کی، اس کے دور میں اس کو بڑا عروج حاصل ہوا، اس عروج نے ابن رشد کے بہت سے حاسد پیدا کر دیے جن کی سازش سے ابن رشد کو بڑے مصائب میں مبتلا ہونا پڑا جس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے،

ابن رشد کے فقہی کمال کا سب سے بڑا ثبوت اس کی فقہی تصانیف ہیں، اس نے فقہ میں

[1] ترجمہ اردو رینان ص ۱۳ [2] مقالات شبلی حصہ ہفتم ص ۱۱۷ [3] الدیباج المذہب ص ۲۸۴

بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں جو موجود ہیں یا جن کے نام معلوم ہیں وہ آٹھ یا نو ہیں، اس مضمون میں ان کا مختصر ذکر اور اس کی سب سے اہم تصنیف بدایۃ المجتہد پر تفصیلی تبصرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد۔ اس کتاب کا ذکر محمد بن علی شاطبی، ابن الابار، ابن ابی اصیبعہ[1] اور ابن فرحون المکی[2] نے کیا ہے، اس کا قلمی نسخہ اسکوریال کی لائبریری میں موجود ہے، بعض نے اسی کتاب کا نام کتاب المقتصد لکھا ہے،[3] بعض نے نہایۃ المجتہد[4] بعض نے بدایۃ المجتہد[5] بعض نے کفایۃ المجتہد،[6] خود ابن رشد نے اس کتاب کا نام بدایۃ المجتہد وکفایۃ المقتصد لکھا ہے،[7] ۱۳۲۰ھ میں سلطان عبد الحفیظ سابق سلطان مراکش نے اپنے شاہی کتب خانہ کا قدیم وصحیح قلمی نسخہ شائع کرایا، فقہ میں ابن رشد کی یہ پہلی کتاب ہے جو پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اس کے بعد اس نسخہ کو پیش نظر رکھ کر ۱۳۳۵ھ میں مصر سے اس کا دوسرا اڈیشن نکلا،[8] پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد ۱۳۳۹ھ میں ایک ہندوستانی اور مصری فرم نے ملکر اس کتاب کو شائع کیا،[9] اور اب ہر جگہ دستیاب ہوتی ہے، ہم آئندہ صفحات میں اس پر مفصل ریویو کریں گے۔

(۲) خلاصۃ المستصفی۔ یہ ابن رشد کی دوسری کتاب ہے، اس کا نام مختصر المستصفی فی اصول الفقہ ہے،[10] یہ الغزالی کی کتاب المستصفی کا جو اصول فقہ پر ہے، اختصار ہے،

[1] طبقات الاطباء ص ۷۵، [2] الدیباج المذہب ص ۲۸۴ [3] ترجمہ رینان ص ۱۰، [4] نفح الطیب ج ۲ ص ۱۳۰ [5] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۲ [6] کشف الظنون حاجی خلیفہ بحوالہ ابن رشد فرنگی محلی مرحوم ص ۱۰۲ [7] بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۴ [8] ابن رشد فرنگی محلی مرحوم ص ۱۳۲ [9] بدایۃ المجتہد (طبع مطبعہ مصطفی البابی الحلبی واولادہ بمصر علی نفقتہم ونفقۃ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی فی بمبائی) اس مضمون میں اسی کتاب سے حوالے دیے گئے ہیں [10] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۲۔

ابن الابار نے اس کا ذکر کیا ہو اور کتب خانہ اسکوریال کی فہرست میں بھی اس کا نام ہے، مقری نے لکھا ہے کہ ابن سعید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے،[1] ابن فرحون مالکی کتاب الدیباج المذہب اور ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطباء میں بھی اس کا ذکر ہے۔[2]

(۳) **النظر فی اغلاط الکتب الفقہیہ**۔ یہ تین جلدوں میں ہے۔ لاؤن افریقی نے اس کا ذکر کیا ہے۔[3] رینان کی کتاب کے اردو ترجمہ میں مذکورہ نام دیا گیا ہے، محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام "کتاب فی التنبیہ الی اغلاط المتون" لکھا ہے۔[4]

(۴) **اسباب الاختلاف**۔ یہ کتاب بھی تین جلدوں میں ہے، اور اس کا ایک عربی نسخہ کتب خانہ اسکوریال میں موجود ہے،[5] معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر مولانا محمد یونس مرحوم نے ابن رشد کی جانب اس کتاب کی نسبت پر شبہ کا اظہار کیا ہے،[6] محمد لطفی جمعہ نے الدعاوی (۳ جلدیں) نام کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے،[7] معلوم نہیں اسی کتاب کا دوسرا نام ہے۔ یا یہ کوئی اور کتاب ہے۔

(۵) **اصولِ فقہ کا نصاب کامل**۔ کتب خانہ اسکوریال میں ہے۔[8] محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام دروس فی الفقہ العربی لکھا ہے،[9]

(۶) **رسالہ اضحیہ** (منہ) شاید یہ مذکورۂ بالا کتاب کے کسی حصہ کا دوسرا نسخہ ہو،[10] اس میں قربانی سے متعلق احکام ہوں گے۔

(۷) **رسالہ عشر**۔ (منہ) یہ بھی اوپر کی کتاب کی طرح اصل کتاب دروس فی الفقہ العربی

---

[1] رینان ص ۷۷، [2] الدیباج ص ۲۸۴ و طبقات الاطباء ص ۷۷، [3] رینان ص ۷۷، [4] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۲ [5] رینان ص ۷۷، [6] ابن رشد مولوی محمد یونس فرنگی محلی ص ۱۲۷ [7] تاریخ فلاسفۂ اسلام محمد لطفی جمعہ ص ۲۱۲ [8] رینان ص ۷۷، [9] لطفی جمعہ ص ۲۱۲ [10] ترجمہ کتاب رینان ص ۷۷،

کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے، محمد لطفی جمعہ نے اس کا نام کتاب الخراج لکھا ہے،[1] مولانا محمد یونس مرحوم نے اس رسالہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔[2]

(۸) **فرائض السلاطین والخلفاء**۔ حاکموں اور سود خواروں کے ناجائز فوائد پر ہے، ابن ابی اصیبعہ نے اس کو ابن رشد کی جانب منسوب کیا ہے،[3] لطفی جمعہ نے اس سلسلہ میں ایک کتاب الکسب الحرام کا نام لکھا ہے،[4] غالباً یہ اسی کتاب کا دوسرا نام ہے،

(۹) **منہاج الادلہ**۔ اس کتاب کو مولانا محمد یونس مرحوم نے ابن ابی اصیبعہ کی روایت سے کتب فقہ کی فہرست میں داخل کیا ہے،[5] علامہ شبلی نعمانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اور اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اصولِ فقہ میں اس کی مستقل تصنیف ہے،[6] لطفی اور رینان کی فقہ کی فہرست میں اس کا ذکر نہیں ہے،

ابن ابی اصیبعہ نے فقہ کی دو اور کتابیں ابن رشد سے منسوب کی ہیں، کتاب التحصیل اور کتاب المقدمات۔ کتاب التحصیل کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں ابن رشد نے صحابہ و تابعین اور ائمہ کے اختلافات تحریر کیے ہیں، اور ہر ایک کے دلائل بیان کر کے محاکمہ کیا ہے،[7] لیکن اس میں ابن ابی اصیبعہ کو دھوکا ہوا ہے، یہ دونوں کتابیں ابن رشد کے دادا ابن رشد اکبر کی ہیں۔ غالباً یہ غلطی یہیں سے چلی ہے، جسے بعد کے مصنفین نے نقل کر دیا ہے، مثلاً سلیم میخائیل،[8] نواب صدیق حسن خاں[9] اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ،[10] الدیباج المذہب میں ابن رشد اکبر کے تذکرے میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

---

[1] تاریخ فلاسفۂ اسلام ص ۲۱۲، رینان ص ۷۷، [2] ابن رشد مولوی محمد یونس مرحوم ص ۱۲۷، [3] رینان ص ۷۷، [4] تاریخ فلاسفہ اسلام ص ۲۱۲ [5] ابن رشد مولوی یونس مرحوم ص ۱۲۷ [6] مقالات شبلی جلد پنجم تاریخی حصہ اول ابن رشد [7] طبقات الاطباء ص ۷۷، رینان ص ۷۷، [8] آثار الادہار ص ۲۲۲ [9] التاج المکلل ص ۲۰۲ [10] مقالات شبلی جلد پنجم تاریخی حصہ اول

الف کتاب البیان والتحصیل	انھوں نے "کتاب البیان والتحصیل
لمانی المستخرجۃ من التوجیہ	لمانی المستخرجۃ من التوجیہ والتعلیل"
والتعلیل تنیف علی عشرین	لکھی ہے، جو تقریباً بیس جلدوں پر مشتمل
مجلدا وکتاب المقدمات	ہے، اور کتاب المقدمات لاوائل
لاوائل کتب المدونۃ[1]	کتب المدونۃ لکھی ہے۔

یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مصر میں چھپ گئی ہے،

رینان نے ابن رشد کی فقہی کتابوں کے تذکرے کے بعد لکھا ہے کہ پہلی اور دوسری کتاب یعنی بدایۃ المجتہد و مختصر المستصفی کی نسبت تحقیق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابن رشد کی ہیں، کیسی ای نیر (Cacirnere) نے جو نام لکھے ہیں ان میں ایک کا بھی پتہ ابن رشد کی سوانح عمریوں میں نہیں چلتا، چونکہ ابن رشد کے نام کے تین مشہور فقیہ گذرے ہیں، خاص کر جد ابن رشد ۵۲۰ھ میں تھا اور جس کی تصانیف اسکوریال لائبریری میں موجود ہیں اسلیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان کے ناموں اور تصانیف میں خلط ملط ہو گیا ہو[2]۔

واقعہ جو بھی ہو، ابن رشد کی جانب ان تصنیفوں کی نسبت اس بات کی بہرحال دلیل ہے کہ اس نے بہت سی کتابیں اس فن میں تصنیف کیں،

بدایۃ المجتہد اور بعض دوسری کتب فقہ کا موازنہ

ابن رشد کی فقہی عظمت کے لیے اس کی صرف ایک کتاب بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد کافی ہے، الدیباج المذہب میں ہے:

ولا یعلم فی وقتہ انفع منہ	اس کے عہد میں اس سے زیادہ نفع بخش
ولا احسن سیاقا[3]	اور بہتر کتاب موجود نہیں تھی،

[1] الدیباج المذہب لابن فرحون مالکی ص ۲۶۹ [2] کتاب رینان ص ،، [3] الدیباج المذہب ص ۲۸۴

اور یہ حقیقت ہے کہ آج بھی اس کی یہ خصوصیت بجنسہٖ برقرار ہے، فقہ میں مبسوط امام سرخسی، فتح القدیر، امام شعرانی کی فقہ جامع[1] وغیرہ، اسی طرز کی کتابیں ہیں، لیکن اختصار، جامعیت اور متانت استدلال میں بدایۃ المجتہد سے بہت پیچھے ہیں، مبسوط امام محمد کی کتاب کی شرح ہے اور فتح القدیر ہدایہ کی، ان دونوں کتابوں کا امتیاز فروع کا احاطہ ہے، ان میں ائمہ احناف اور امام شافعی کے اختلافات مذکور ہیں، دوسرے ائمہ اور مجتہدین کے خیالات بہت کم ملتے ہیں، اور احناف کے مسالک کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے ان کو بدایۃ المجتہد کے طرز کی کتاب کہنا صحیح نہیں ہے،

امام علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ کی بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بدایۃ المجتہد سے پہلے کی ہے، اس میں فقہ اور مسائل فقہ کے ابواب کو فنی اعتبار سے درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ خود مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

اذ الغرض الاصلی والمقصود	جملہ فنون میں کسی تصنیف کا اصل مقصد
الکلی من التصنیف فی کل فن من	و منشا یہ ہوتا ہے کہ طالبین کے لیے مطلوب
فنون العلم ھو تیسیر سبیل	تک پہنچنے کی راہ آسان کی جائے اور اسکو
الوصول الی المطلوب علی الطالبین	اس سے اخذ کرنے والوں کیلئے قریب الفہم
وتقریبہ الی افہام المقتبسین	کیا جائے اور یہ مقصد کسی فنی اور حکیمانہ
ولا یلتئم ھذا المراد الا بترتیب	ترتیب کے بغیر پورا نہیں ہوتا، یہ ترتیب
تقتضیہ الصناعۃ وتوجبہ	ایسی ہونی چاہیے کہ مسائل کی قسموں
الحکمۃ وھو التصفح عن اقسام	اور اس کی فصلوں کو الگ الگ کیا جائے

[1] ابن رشد از مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم ص ۱۵۳

المسائل وفصولها وتخريجها على قواعدها	اور انہیں ٹھیک اصول وقواعد کے مطابق
واصولها ليكون اسرع فهما واسهل	درج کیا جائے تاکہ سمجھنے اور محفوظ کرنے
ضبطا وايسر حفظا فتكثر الفائدة و	میں آسانی ہو، اور اس سے منفعت
تتوفر العائدة فصرفت العناية الى ذلك	اور فائدہ زیادہ ہو، اس لیے میں نے اسکی
وجمعت فى كتابى هذا اجلا	جانب توجہ کی اور اپنی اس کتاب میں
من الفقه مرتبة بالترتيب	فقہ کا ایک بڑا مجموعہ فنی ترتیب اور
الصناعى والتاليف الحكمى	حکیمانہ تالیف کے ساتھ جمع کیا جسے اہل فن
الذى ترتضيه ارباب الصنعة	اور صاحب حکمت لوگ پسند کریں گے،
وتخضع له اهل الحكمة مع	اس کے ساتھ واضح دلائل اور مضبوط
ايراد الدلائل الجلية والنكت	نکتے بھی ایسی عبارتوں میں لکھ دیئے ہیں
القوية بعبارات محكمة المبانى	جن کی بنیاد مضبوط اور معانی ومطالب
مؤدية المعانى وسميته	کے اظہار کے لیے مناسب ہے، نام میں نے
بدائع الصنائع فى ترتيب	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع
الشرائع اذهى صنعة بديعة	رکھا ہے، یہ ایک انوکھی صناعی، عجیب
وترتيب عجيب وترصيف	ترتیب اور نادر مرصع کاری ہے تاکہ اسکا
غريب لتكون التسمية موافقة	نام مسمی کے موافق اور اس کی صورت
للمسمى والصورة مطابقة للمعنى[1]	معنی کے عین مطابق ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب مصنف کے دعوی کے مطابق ہے، اور اس کی ترتیب دوسری

[1] مقدمۂ کتاب بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للامام علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی،

کتب فقہ کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے، لیکن اس کے باوجود ابن رشد کی کتاب کو نہیں پہنچتی، بدایہ کی فنی ترتیب ہی کچھ اور ہے، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے، بدائع الصنائع میں پہلے ایک نوع کے مسائل کے لیے "کتاب" کا عنوان قائم کیا گیا ہے، مثلاً کتاب الطہارات پھر "الکلام" کے عنوان سے اس 'کتاب' کی مختلف قسمیں کر دی ہیں، مثلاً الکلام فی الوضوء الکلام فی الغسل وغیرہ، اس کے بعد چھوٹی چھوٹی فصلیں قائم کر کے بہت سے بنیادی یا فروعی مسائل کا ذکر کیا ہے، مگر ان سب میں صرف ائمۂ احناف یا امام شافعی کے اختلافات مذکور ہیں۔

مصر سے ایک کتاب "کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف عبدالرحمن الجزیری ہیں، یہ کتاب اس حیثیت سے بدایۃ المجتہد کے طرز پر کہی جا سکتی ہے کہ اس میں متعدد مسلکوں کا ذکر ہے، مگر یہ تعدد بھی چار مذاہب میں محدود ہے، اس کے مقابلہ میں ابن رشد نے ائمۂ اربعہ کے علاوہ امام داؤد ظاہری، امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابو ثور، ابن حزم، ابن عبدالبر وغیرہ بہت سے ائمہ کے اقوال کا ذکر کیا ہے، عبدالرحمن الجزیری کی کتاب بہت طویل اور بڑے سائز کی چار ضخیم جلدوں میں ہے، جزء اول قسم العبادات، جزء ثانی وثالث قسم المعاملات اور جزء رابع قسم الاحوال الشخصیہ۔ اس کتاب میں کہیں کہیں احکام کے علل بھی بیان کیے گئے ہیں، اور کہیں کہیں کتاب وسنت سے دلائل دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے،

ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں تقلید کے عام ہونے تک پیدا ہونے والے ان تمام مسائل کو ذکر کیا ہے، جن کا نصوص میں ذکر ہے، یا شریعت سے ان کا قریبی تعلق ہے، خواہ یہ مسائل متفق علیہ ہوں یا مختلف فیہ اور ان کے اسباب اختلاف اور دلائل کا خصوصیت

کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ان مسائل کی حیثیت ایسے اصول و قواعد کی ہے جو مجتہد کو پیش آسکتے ہیں، اور جن کا ذکر شریعت میں نہیں ہے۔[1]

بدایہ کا طرز اس کی فنی ترتیب جدید طرز کی ہے۔ کتاب الجہاد کو ابواب معاملات پر مقدم کیا ہے، کیونکہ اسلام میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بعد جہاد ہی کا نمبر ہے، اسی طرح کتاب الاشربہ اور کتاب الضحایا کو معاملات کی فہرست سے جدا کر دیا ہے، کیونکہ اسلام میں ان چیزوں کی حیثیت محض تعبدی ہے،[2] مسائل کے ذکر میں سب سے پہلے کسی چیز سے متعلق بحث کو کتاب کے عنوان سے شروع کیا ہے، پھر اس کو مختلف ابواب، فصول، مسائل اور انواع میں تقسیم کیا ہے، جس سے احکام کی تلاش اور یاد داشت میں بڑی آسانی ہو گئی ہے، جس حکم میں جتنے فروع نکلتے ہیں، اس میں اتنے ہی درجات قائم کئے ہیں، مثلاً طلاق کی بحث میں 'کتاب الطلاق' عنوان قائم کر کے اس میں چار جملے (مجموعے) متعین کیے ہیں، مجموعۂ اولیٰ انواعِ طلاق میں مجموعہ ثانی ارکان طلاق میں، مجموعہ ثالث، رجعت میں، مجموعہ رابع مطلقات کے احکام میں، پھر ہر جملہ (مجموعہ) کے ابواب قائم کیے ہیں، مثلاً جملہ اولیٰ میں پانچ باب ہیں، پھر ہر باب میں کئی کئی مسئلوں کا ذکر ہے،[3]

جملہ اخیرہ (رابعہ) میں دو باب قائم کیے ہیں، اور باب اول کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے، اور فصل اول کی دو نوعیتیں بنائیں اور نوع ثانی میں الگ الگ مسائل لکھے ہیں،[4] بحیثیت مجموعی کتاب کی ترتیب اور طرز نگارش کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دوسری کتب فقہ کو اس سے کوئی نسبت نہیں،

---

[1] بدایۃ المجتہد جزء اول ص ۱ دیباچہ [2] ابن رشد مولانا محمد یونس فرنگی محلی ص ۱۴۰، [3] بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ج ۲ ص ۵۶، ۶۲ [4] ایضاً ج ۲ ص ۸۳ تا ۹۰

کتاب بدایۃ المجتہد کا مقصد اس کتاب کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ دوسری کتب فقہ کے برخلاف اس کی غرض و غایت اجتہاد کی صلاحیت پیدا کرنا ہے، ائمۂ اربعہ اور ان کے اصحاب کے بعد تقلید کے عام رواج کی بدولت فقہاء کے صرف تین چار معمولی کام رہ گئے تھے، امام سے جو اصولی مسائل مروی ہیں ان کو پیش نظر رکھکر ابواب فقہ کے فروع کو ترتیب دینا، امام کی مختلف روایتوں کو تلاش کر کے انھیں باہم ترجیح دینا، ان کی صحت و غلطی دریافت کرنا، وقائع و نظائر ممکنہ وغیر ممکنہ کو ابواب فقہ کے مطابق ترتیب دینا، فروع مذہب کی طویل کتابوں کی مختصر شرحیں اور حاشیے لکھنا، ان کے علاوہ حنفیہ و شافعیہ کے تنازعات کے بدولت ایک خاص فن جدل و خلاف بھی پیدا ہو گیا تھا، جس میں ہر فریق اپنے امام کے آراء و مذاہب کی متعصبانہ تائید و حمایت کرتا تھا، اور اس کے لیے رطب و یابس، قوی و ضعیف ہر طرح کے دلائل دیے جاتے تھے، اس سے بحث نہیں تھی کہ درحقیقت کون مذہب حق ہے، اس لیے ان کتابوں سے استعداد فقہی تو ضرور پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کا دائرہ بہت محدود ہے، اور صرف تخریج و ترجیح اقوال اور استنباط فروع کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، اور ہر فریق یہ سمجھنے لگتا ہے کہ حق اسی کے ساتھ ہے، ملکۂ اجتہاد کا یہ فقدان مسلمانوں کے لیے ہر حیثیت سے مضر ثابت ہوا، لیکن اس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہوا، جن کو ہوا ان میں ابن رشد بھی ہے، اس نے بدایۃ المجتہد اسی غرض سے لکھی،[1] وہ لکھتا ہے :-

ان فی قوۃ ھذا الکتاب ان	جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کتاب میں یہ وصف
یبلغ بہ الانسان کما قلنا رتبۃ	ہے کہ انسان اس کے ذریعہ اجتہاد کے
الاجتھاد اذا تقدم فعلم من	رتبہ کو پہنچ سکے گا، بشرطیکہ وہ لغت،
اللغۃ والعربیۃ وعلم من اصول	عربیت اور اصول فقہ سے اتنی واقفیت

الفقه ما يكفيه في ذلك ولذلك رأينا ان اخص الاسماء بهذا الكتاب ان نسميه بداية المجتهد وكفاية المقتصد[1]

حاصل کرلے جو اس کے لیے کافی ہو، اس لیے ہمارے خیال میں اس کا سب سے مناسب نام بدایۃ المجتہد وکفایۃ المقتصد ہے۔

اس غرض کے حصول کے لیے ابن رشد نے جن باتوں کا التزام کیا ہے، ان سے کتاب میں امتیازی شان پیدا ہوگئی ہے، عام طور پر کتب فقہ میں فروع مسائل جمع کیے جاتے تھے، جن سے اصول کے سمجھنے میں بہت کم مدد ملتی تھی، باب اجتہاد بالکل مسدود تھا، اور فروع تک میں جزئیات کی پابندی لازمی خیال کی جاتی تھی، ابن رشد نے اس کتاب میں یہ مقلدانہ طرز ترک کر دیا تاکہ اصول سے استنباط فروع کا ملکہ پیدا ہو، اور اصول میں بھی صرف ان کو لے لیا جن کی شرع میں صراحت موجود ہے، یا ائمہ نے ان میں اختلاف کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے[2]

قصدنا في هذا الكتاب انما هو ان نثبت المسائل المنطوق بها في الشرع المتفق عليها والمختلف فيها .... فان معرفة هذين الصنفين من المسائل هي التي تجري على المجتهد مجرى الاصول في المسكوت

اس کتاب سے ہمارا مقصد یہ ہو کہ اس میں شرع کے متفق علیہ و مختلف فیہ مسائل درج کریں کیونکہ انہی دونوں قسموں کے مسائل مسکوت عنہ اور نئے پیدا شدہ مسائل میں بطور اصول موضوعہ کام آتے ہیں، اور اگر ان مسائل کی واقفیت کے ساتھ فقہا کے اختلافات کے علل و

۱؎ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۳۶۴ ۲؎ ابن رشد مولانا فرنگی محلی ص ۱۴۹

عنها وفي النوازل .... ويشبه ان يكون من تدرب في هذه المسائل وفهم اصول الاسباب التي اوجبت خلاف الفقهاء ان يقول ما يجب في نازلة من النوازل[1]

اسباب بھی ذہن میں ہوں تو انسان ہر جدید واقعہ کی بابت فتویٰ دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔

کتاب البیوع میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

نذكر منها اشهرها لتكون كالقانون للمجتهد النظار[2]

ہم اس فصل کے صرف مشہور مسائل لکھیں گے تاکہ وہ صاحب نظر مجتہد کیلئے قانون کا کام دیں۔

اس بات کا ابن رشد نے مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے، باب قضاء الصلوٰۃ کے آخر میں لکھتے ہیں

وفروع هذا الباب كثيرة وكلها غير منطوق بها وما قصدنا ههنا الا ما يجري مجرى الاصول[3]

اس باب کے فروع بہت سے ہیں لیکن سب کے سب غیر منطوق ہیں (یعنی نصوص شرعیہ میں ان کا ذکر نہیں ہے) اور ہمارا ارادہ صرف ان مسائل کے ذکر کرنے کا ہے جو اصول کے طور پر کام آئیں۔

ان تمام فقہی اختلافات کو چھ اسباب کے تحت جمع کیا ہے:

واما اسباب الاختلاف بالجنس

اختلاف کے اسباب عام طور پر چھ ہیں،

۱؎ بدایۃ المجتہد ص ۳۶۳ بحوالہ ابن رشد ص ۱۴۹ ۲؎ بدایۃ المجتہد ج ۲ ص ۱۴۲ ۳؎ ایضاً ج ۱ ص ۱۷۵

فستة احدها تردد الالفاظ بين
هذه الطرق الاربع اعنى بين
ان يكون عاما يراد به الخاص
او خاصا يراد به العام او عاما
يراد به العام او خاصا يراد به
الخاص. او يكون له دليل خطاب
او لا يكون له. والثانى الاشتراك
الذى فى الالفاظ وذلك اما فى
اللفظ المفرد كلفظ القرء الذى
ينطلق على الاطهار وعلى الحيض
وكذلك لفظ الامر هل يحمل
على الوجوب او على الندب ولفظ
النهى هل يحمل على التحريم او الكراهية
..... والثالث اختلاف الاعراب
والرابع تردد اللفظ بين حمله
على الحقيقة وحمله على نوع من
انواع المجاز التى هى اما الحذف
واما الزيادة واما التقديم و
اما التاخير واما تردده على

اول یہ کہ الفاظ کا ان چار طریقوں میں
استعمال ہونا یعنی لفظ عام ہو اس سے
خاص مراد ہو یا خاص ہو اور معنی عام
مراد ہو یا لفظ عام ہو اور معنی بھی عام
مراد ہو یا لفظ خاص ہو اور معنی بھی خاص
مراد ہو، یا وہاں دلیل خطاب ہو یا نہ ہو،
دوسرے وہ اشتراک جو الفاظ میں پایا جاتا
ہے، جیسے لفظ قرء جو طہر اور حیض دونوں
کے لیے بولا جاتا ہے، ایسے ہی لفظ امر آیا
وجوب پر محمول ہوگا، یا ندب پر، اور
لفظ نہی تحریم پر محمول ہوگا یا کراہیت پر
..... تیسرے اعراب کا اختلاف، چوتھے
لفظ کا کبھی حقیقت پر استعمال ہونا اور کبھی مجاز کی
مختلف قسموں میں استعمال ہونا مثلاً حذف، استعارہ وغیرہ،
پانچویں لفظ کا کبھی مطلق آنا اور کبھی مقید آنا جیسے غلام آزاد
کرنے میں ایک بار حکم مطلق آیا ہے، اور
ایک بار ایمان کی قید کے ساتھ، چھٹے یہ کہ
الفاظ کی ان قسموں میں جن سے احکام
شرع اخذ ہوتے ہیں، باہم تعارض ہونا،

الحقيقة او الاستعارة والخامس
اطلاق اللفظ تارة وتقييده
تارة مثل اطلاق الرقبة فى
العتق وتقييدها بالايمان تارة
والسادس التعارض فى الشيئين
فى جميع اصناف الالفاظ التى
يتلقى منها الشرع الاحكام بعضها
مع بعض وكذلك التعارض
الذى ياتى فى الافعال أو فى
الاقرارات او تعارض القياسات
انفسها او التعارض الذى
يتركب من هذه الاصناف
الثلاثة اعنى معارضة القول
للفعل او للاقرار او للقياس
ومعارضة الفعل للاقرار
او للقياس ومعارضة الاقرار للقياس.[1]

ایسے ہی وہ تعارض ہے جو نبی کے افعال
اور اقرارات میں پایا جائے یا قیاسات کا
آپس میں معارض ہونا یا وہ تعارض جو ان
تین قسموں میں پیدا ہو یعنی فرمودات نبی
کا آپ کے افعال سے یا اقرارات سے
یا قیاس سے یا آپ کے افعال کا اقرار
سے یا قیاس یا اقرار کا قیاس سے
معارض ہونا۔

کتاب کے ہر مسئلہ میں ثابت کیا ہے کہ اختلافات انہی چھ اسباب کی بنا پر ہوئے ہیں
اور جا بجا اس کی طرف اشارے بھی کیے ہیں۔

---

[1] بدایۃ المجتہد ج ۱ مقدمہ ص ۵

حدیث میں ابن رشد کا مرتبہ ایک ماہر فقیہ کے لیے احادیث پر عبور ضروری ہے، بدایۃ المجتہد کی بعض بحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث میں ابن رشد کا مقام کتنا اونچا تھا، وہ بلا تکلف احادیث کے ضعف، علل، قوت، مخرجین اور راوین پر بحث کرتے ہیں، مثلاً "مسح علی الخفین" کی بحث میں کہتے ہیں :-

(قلت) اما حدیث علیؓ فصحیح	رہی حضرت علیؓ کی حدیث تو وہ صحیح ہے
خرجہ مسلم واما حدیث ابی	اس کی تخریج امام مسلم نے کی ہے، اور ابی
بن عمارۃ فقال فیہ ابو عمر	ابن عمارۃ کی حدیث کے بارے میں ابن
ابن عبد البر انہ حدیث لا یثبت	عبد البر نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں
ولیس لہ اسناد قائم	ہے اور نہ اسکی سند ٹھیک ہے، اور
واما حدیث صفوان بن عسال	صفوان بن عسال کی حدیث کا اگرچہ
فھو ان کان لم یخرجہ البخاری	امام بخاریؒ و مسلمؒ نے نہیں ذکر کیا ہے
ولا مسلم فانہ قد صححہ قوم	لیکن اہل علم کی ایک جماعت نے اسے
من اہل العلم[1]	صحیح قرار دیا ہے۔

السجود علی الجبھۃ والانف کی بحث میں فیصلہ کن طور پر کہتے ہیں

(قال القاضی ابو الولید) وذکر	قاضی ابو الولید (ابن رشد کی کنیت)
بعضھم الجبھۃ فقط وکلا الروایتین	نے کہا کہ بعض نے صرف پیشانی کا ذکر کیا
موجود فی کتاب مسلم[2]	ہے، اور یہ دونوں روایتیں امام مسلم کی کتاب میں

فقہ میں وسعت معلومات فقہ میں ان کی وسعت معلومات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ

اس کتاب میں انھوں نے ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے بہت سے ائمہ کے اقوال اور ان کے دلائل وضاحت کے ساتھ پیش کیے ہیں، مثلاً امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابوداؤد ظاہری، ابو ثور، ابن ابی لیلیٰ، سفیان بن عیینہ، ابن جریج، عطا بن دینار، اشہب، سحنون، طبری وغیرہم۔

ابن رشد کی بے تعصبی اور مجتہدانہ شان کہنے کو تو ابن رشد مالکی تھے اور انھوں نے عموماً اپنی کتاب میں مالکی فقہ کو ترجیح دی ہے لیکن کسی ایک امام کی تقلید وتائید کی ترغیب اس کتاب کے مقصد کے خلاف تھی، اس لیے وہ اس سے الگ ہے اور اس میں انھوں نے ائمہ کے اقوال مع ان کے دلائل کے جمع کر دیے ہیں اور اس کی کوشش کی ہے کہ جس کے دلائل جس حیثیت کے ہیں اسی حیثیت سے بیان کر دیے جائیں تاکہ لوگوں میں علی وجہ البصیرت کسی رائے کے اختیار اور ترک کرنے کا ملکہ ہو، چنانچہ اکثر مقامات پر فقہاء کی رایوں کی وضاحت کے بعد "فتأملہ" (تم خود غور کر لو) کہہ کر فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے[1]،

بعض مسائل میں محاکمہ کیا ہے اور دلیل کی قوت کی بنا پر کسی ایک رائے کو ترجیح دی ہے اور اس کی مطلق پروا نہیں کی ہے کہ یہ رائے امام مالک کے خلاف جاتی ہے یا کسی اور کے۔ بہت سے مسائل میں امام مالک کی رایوں کی کمزوری پر تعجب ظاہر کیا ہے، اور دوسرے ائمہ کی رایوں کو سراہا ہے،

مطلقہ کے وارث ہونے کے بارے میں ائمہ کے اقوال لکھنے کے بعد آخر میں لکھا ہے،

وسوی مالک فی ذلک کلہ	اس مسئلہ میں امام مالک نے سب کو برابر
حتی لقد قال ان ماتت لا	قرار دیا ہے، اور یہانتک کہہ دیا ہے کہ
یرثھا وترثہ ھی ان مات، وھذا	اگر مطلقہ عورت پہلے مرجائے تو شوہر

مخالف للاصول جدا[1]

وارث نہیں ہوگا، اور اگر شوہر مر جائے تو عورت وارث ہوگی، حالانکہ یہ بات اصول کے بالکل خلاف ہے۔

سور کلب (کتے کے جوٹھے) کے بارے میں لکھا ہے

واما قیل فی المذهب من هذا الکلب هو الکلب المنهی عن اتخاذه او الکلب الحضری فضعیف وبعید من التعلیل۔[2]

مذہب مالکی میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ وہ کتا ہے جس کے پالنے سے روکا گیا ہے یا شہری کتا، تو یہ کمزور بات ہے اور کسی چیز کی علت بننے سے قاصر ہے۔

اسی طرح لعان کے مسئلے میں عورت کے نکول (قسم سے انکار) کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا فتوی درج کرنے کے بعد لکھا ہے

فابو حنیفة فی هذه المسئلة اولی بالصواب انشاء الله تعالیٰ[3]

ابو حنیفہ کی رائے اس مسئلہ میں انشاء اللہ تعالیٰ حق و صواب سے زیادہ قریب ہے۔

بعض ان فروعی مسائل میں جن کے متعلق کئی حدیثیں ملتی ہیں اور ترجیح کے لیے کوئی قوی دلیل بھی نہیں، تخییر کی رائے دی ہے، یعنی نوافل اور سنن سے تعلق رکھنے والے غیر بنیادی مسائل فن میں نسخ کی کوئی دلیل نہیں ہے، آدمی کو اختیار رہنا چاہیے، جس قول پر چاہے عمل کرے۔

اسی طرح وہ فقہاء کی بعض مشکل پابندیوں کے بھی خلاف ہیں، جمعہ کی نماز کے متعلق فقہاء و مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہادات سے بہت سے قیود و شرائط عائد کیے ہیں جن کا مبنٰی صرف یہ ہے کہ یہ شرطیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمعہ کی نمازوں میں اتفاقی یا غیر اتفاقی طور پر برابر پائی جاتی رہی ہیں۔ ابن رشد جمعہ سے متعلق ائمہ کی شرطوں کے ذکر کرنے کے بعد ان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں

۱؎ بدایۃ جلد ثانی ص ۸۰، ۲؎ ایضاً ج ۱ ص ۲۰ ۳؎ ایضاً ج ۲ ص ۱۱۳

وهذا کله تعمق فی هذا الباب ودین الله یسر، ولقائل ان یقول ان هذه لو کانت شروطا فی صحة الصلوٰة لما جاز ان یسکت عنها علیه الصلوٰة والسلام ولا ان یترك بیانها لقوله تعالیٰ لتبین للناس ما نزل الیهم۔ ولقوله تعالیٰ ولتبین لهم الذی اختلفوا فیه۔ والله المرشد للصواب۔[1]

یہ سب اس باب میں انتہا پسندی ہے، حالانکہ اللہ کا دین آسان ہے، ایک کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چیزیں نماز کی صحت کے لیے شرط ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارہ میں سکوت نہ فرماتے اور اس کی وضاحت نہ چھوڑتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے "لتبین للناس ما نزل الیهم" اور "لتبین لهم الذی اختلفوا فیه" اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ یہ کتاب اسلوب تحریر، ترتیب مضامین، جمع اقوال ائمہ، قوت استدلال اور فقاہت میں بے نظیر اور مصنف کی فقہی مہارت کا واضح ثبوت ہے، اور ہر حیثیت سے دیگر کتب فقہ پر فوقیت رکھتی ہے۔ ابن سعید نے ان الفاظ میں اس کی تعریف کی ہے۔

کتاب جلیل معظم عند المالکیة[2]

یہ کتاب نہایت عظیم اور مالکیہ کیلئے معتمد علیہ ہے،

لیکن حق یہ ہے کہ صرف مالکیوں کے لیے نہیں بلکہ تمام علمائے اسلام کے لیے مفید ہے اور اسکا مطالعہ اجتہاد کی استعداد پیدا کرتا ہے۔[3]

گمنامی کے اسباب لیکن یہ بڑا المیہ ہے کہ تقلید و روایت پرستوں نے نہ صرف اس بے مثال کتاب کو نظر انداز کر دیا، بلکہ اس کے جلیل القدر مصنف کے فقہی کارناموں سے بھی صرف نظر

۱؎ بدایۃ المجتہد جلد اول ص ۱۰۶، ۲؎ نفح الطیب ج ۲ ص ۱۲۷، ۳؎ ابن رشد مولانا محمد یونس مرحوم ص ۱۵۳

کرلیا[1] اور اس پر کفر کے فتوے لگے، اس کے حسب ذیل اسباب ہوسکتے ہیں:

ابن رشد فقیہ کے ساتھ فلسفی بھی تھا، فلسفہ میں اسے امامت کا درجہ حاصل تھا، اور اندلس میں فلسفہ سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں تھی، علامہ مقری نفح الطیب میں لکھتے ہیں،

کلما قیل فلان یقرء الفلسفۃ	جب کسی شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ
اطلقت علیہ العامۃ اسم الزندیق	وہ فلسفہ پڑھتا ہے تو فوراً عوام الناس
فان زل فی شبھۃ رجموہ بالحجارۃ	اسے زندیق کا خطاب دے ڈالتے اور
وحرقوہ قبل ان یصل امرہ	اگر کسی مسئلہ میں اس سے لغزش ہوجاتی
الی السلطان[1]	تو قبل اس کے کہ حاکم وقت تک اس کا
	معاملہ پہنچے اس کو پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالتے
	اور اس کی لاش جلا ڈالتے،

ابن رشد نے اپنی کتاب میں اشاعرہ کے مذہب کا رد کیا ہے، اور امام غزالی کی تصنیف تہافت الفلاسفہ کا بھی رد لکھا ہے، اور امام صاحب کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں،[2] یہ چیز بھی علماء کی برہمی کا باعث ہوئی، اس لیے بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے، ابن خلکان نے یوسف بن عبد المومن کے تذکرے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ اسکے دربار میں ابن رشد بھی تھا،[3] صفدی جس کی کتاب مشاہیر اسلام کی انسائیکلوپیڈیا ہے، ایک حرف بھی ابن رشد کے متعلق نہیں لکھتا، اسی طرح جمال الدین قفطی جس نے ابن رشد کی وفات کے ایک مدت بعد اپنی تاریخ الحکماء لکھی ہے، ابن رشد کا نام تک نہیں لیا، حالانکہ اندلس کے بہت سے گمنام فلسفیوں کا تذکرہ اس نے کیا ہے،[4]

---

[1] نفح الطیب مقری جلد اول ص ۱۰۲، [2] ایسے حملوں کیلیے ملاحظہ ہو کشف الادلہ ص۱ بحوالہ ابن رشد ص ۱۸۶ اور تہافت الفلاسفہ ص ۲۳۔۲۴ بحوالہ ابن رشد مولانا محمد یونس [3] تاریخ ابن خلکان ص ۵۵، [4] ابن رشد ص ۹۹

مشرق میں اس کی فقہی حیثیت کی اس لیے شہرت نہیں ہوسکی کہ یہاں خود بڑے بڑے فقہاء و مجتہدین موجود تھے، اس لیے وہ ایک دور دراز کے فقیہ کی طرف کیوں توجہ کرتے، دوسرے یہاں مالکی مذہب رائج نہ تھا، اور ابن رشد مالکی تھا،

استاذ کی شہرت کا ایک بڑا ذریعہ شاگرد ہوتے ہیں، ابن رشد کے شاگرد زیادہ تر یہودی اور عیسائی تھے، جو اس سے صرف فلسفہ پڑھتے تھے، فقہ اسلامی سے ان کو کوئی تعلق نہیں تھا، مسلمان لڑکے بدعقیدگی کی شہرت کی بنا پر بہت کم پڑھتے تھے، وکان اکثر تلامذتہ الیھود والنصاری وقل من یقرء علیہ من المسلمین لانہ کان یری بضعف المعتقد[1] اس لیے اس کے شاگرد بے دین سمجھے جاتے تھے، لوگوں نے ان کے فتوے تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا، اگرچہ بعض شاگردوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ابن رشد کے عقائد عام مسلمانوں سے اتنے مختلف نہیں ہیں، جتنے سمجھے جاتے ہیں،[2]

ہندوستان میں ابن رشد کے ساتھ اعتناء مگر آخر ایک وقت آیا جب ابن رشد کا دنیا نے اعتراف کیا، ہندوستان میں غالباً سب سے پہلے نواب عماد الملک بلگرامی نے ابن رشد پر ایک گرانقدر مقالہ لکھ کر اس کو اہل علم میں متعارف کیا، اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی نے ایک مبسوط مقالہ لکھنا شروع کیا، جو نامکمل رہ گیا، پھر بھی جو کچھ مولانا نے لکھ دیا ہے وہ ابن رشد کی سوانح حیات کا بہترین مرقع ہے، مولانا حمید الدین فراہیؒ فقہ میں ابن رشد کے طرز فکر اور اس کی کتاب بدایۃ المجتہد کو بہت پسند فرماتے تھے، انھوں نے اگرچہ اس پر قلم نہیں اٹھایا لیکن مشہور دینی درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے نصاب میں اس کو داخل کرکے تعلیمی حلقوں میں روشناس کرایا، ۱۹۳۲ء میں دار المصنفین نے ابن رشد پر مولانا محمد یونس مرحوم کی مستقل کتاب شائع کی،

---

[1] آثار الازھار، ص ۲۲۲ [2] رینان ص ۴۸-۴۹

اس میں مصنف نے ابن رشد کی سوانح نگاری کا پورا حق ادا کیا ہے، اس کے بعد اردو میں ابن رشد کے متعلق بہت سی کتابوں کے ترجمے اور مستقل مقالات لکھے گئے، اب اردو میں بھی وافر ذخیرہ ہو گیا ہے، اور ابن رشد اہل علم میں محتاج تعارف نہیں رہ گیا ہے، ہر مکتب فکر اور ہر مسلک فقہ کے لوگ اپنی تصنیفات میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، حنفی مسلک کے علماء نے بھی اپنی تصنیفات میں اس سے استفادہ شروع کر دیا ہے، ترمذی پر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تقریروں کو ان کے شاگرد رشید مولانا یحییٰ کاندھلوی نے جمع کیا ہے، جس پر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کی تعلیقات ہیں، اس میں باب ما جاء فی الوضوء من الریح کے حاشیہ میں ابن رشد کی پوری تقریر نقل کی ہے[1]،

اسی طرح حضرت شیخ الحدیث نے اوجز المسالک الی موطا مالکؒ میں بدایۃ ابن رشد کے جا بجا اقتباسات نقل کیے ہیں، اعادۃ الصلوٰۃ مع الامام کی شرح میں لکھتے ہیں:-

قال ابن رشد اکثر الفقهاء	ابن رشد کا بیان ہے، اکثر فقہاء
علی انه لا یعید منهم مالک	کا یہ مسلک ہے، ایسا شخص اعادہ صلوٰۃ
وابوحنیفة وقال بعضهم	نہیں کرے گا، ان میں امام مالک و
یعید وممن قال بهذا احمد	ابوحنیفہ بھی ہیں اور بعض اعادہ کے
وابوداؤد واهل ظاهر[2]	قائل ہیں، ان میں احمد، داؤد اور اہل ظاہر ہیں

مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم میں ابن رشد کی تحقیقات سے استفادہ کیا ہے، بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے قدموں کے دھونے یا مسح کرنے کے مسئلہ میں بڑی مبسوط بحث کی ہے، جس سے اس کی ادبی و منطقی مہارت پر بھی روشنی پڑتی ہے،

[1] الکوکب الدری ص ۹۴ [2] اوجز المسالک الی موطا امام مالک جلد ثانی ص ۱۲

مولانا شبیر احمد نے صحیح مسلم کے "باب وجوب غسل الرجلین بکمالہما" کے تحت بڑی لمبی شرح لکھی ہے، اور آخر میں ابن رشد کی یہ رائے پیش کی ہے،

واما من طریق المعنی فقال ابن	ابن رشد کا بیان ہے کہ مقصود کے
رشد فی البدایة ان الغسل	لحاظ سے قدموں کا دھونا مسح کے
اشد مناسبة للقدمین	مقابلہ میں زیادہ بہتر ہے، اسی طرح
من المسح کما ان المسح اشد	سر کا مسح کرنا دھونے کی بہ نسبت زیادہ
مناسبة للرؤوس من الغسل	مناسب ہے، کیونکہ پیروں کا میل بغیر دھلے
اذ کانت القدمان لا ینقی	صاف نہیں ہوتا، اور سر کا میل صرف
دنسهما غالبا الا بالغسل	مسح سے صاف ہو جاتا ہے، اور یہ
وینقی دنس الرأس بالمسح	بات بہت عام ہے، فرض عبادتوں
وذلک ایضا غالب والمصالح	میں عقلی مصلحتوں کا سبب بننا کوئی
المعقولة لا یمتنع ان یکون	انہونی بات نہیں ہے، اس طرح شریعت
اسبابا للعبادات المفروضة	نے گویا دو مقصد پیش نظر رکھے، ایک
حتی یکون الشرع لاحظ فیهما	مصلحی دوسرا تعبدی، مصلحی سے مراد
معنیین معنی مصلحیا و معنی	وہ امور ہیں جن کے علل وغیرہ انسان
عبادیا اعنی بالمصلحی ما رجع	محسوس کرے، اور عبادی سے مراد
الی الامور المحسوسة وبا	وہ امور ہیں جن کا تعلق تزکیۂ نفس
لعبادی ما رجع الی زکاة	سے ہوتا ہے،
النفس (فتح الملهم شرح مسلم جزاول ص ۴۰۵)	

اور یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ ہمارے علما ، ابن رشد کی تحقیقات کو جگہ دینے لگے ہیں ،

اس زمانہ میں اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ابن رشد کے طریقۂ کار کو اپنایا جائے ، اور ان کے طرز پر فقہ اسلامی کی تدوین کیجائے ، اس سے گروہی عصبیت اور ملی افتراق کے دور ہونے میں بڑی مدد ملے گی ، اب تمام ائمہ کے اقوال کو مع ان کے دلائل کے جمع کر دینا بہت آسان ہے ، اس سے فائدہ ہوگا کہ اہل علم ان اقوال اور انکے دلائل کا موازنہ کرنے کے بعد جس کو چاہیں گے اختیار کر سکیں گے ، کسی ایک قول کی صحت پر خواہ وہ کتنا ہی ضعیف ہو ، اصرار اہل علم کی شان نہیں ہے ، اصل ماخذ کتاب اللہ اور حدیث رسول ہے ،

قدما میں ائمہ مجتہدین کے تلامذہ بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف کرتے تھے ، امام شعرانیؒ نے اپنی کتاب میزان میں لکھا ہے کہ

> امام قرافی نے اس بات پر صحابہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ عہد صحابہ میں جو شخص حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے فتوی لیتا تھا ، وہ دوسرے صحابہ سے بھی فتوی لیکر اس پر عمل کرتا تھا اور کوئی شخص اس پر نکیر نہیں کرتا تھا[1]

امام قرافی کا یہ قول اس کا ثبوت ہے کہ جس طرح مختلف صحابہ سے فتوی لیکر اس پر عمل کرنا جائز تھا اسی طرح کئی ائمہ کے فتووں کو سامنے رکھکر مضبوط دلیل سے کسی معاملہ میں کسی امام کی پیروی اور دوسرے معاملہ میں دوسرے امام کی پیروی جائز ہے جبکہ تلفیق یا ہوائے نفس کی صورت نہ ہو ، جبالاجماع ناجائز ہے ، اسکی اجازت صرف اہل علم کے لیے ہے ، جو مختلف اقوال کے دلائل میں صحیح موازنہ کر سکیں ۔

ابن رشد نے اپنی کتاب میں اسی صلاحیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ عامل میں خود تفقہ اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہو ،

---

[1] میزان للشعرانی ص ۱۳۹

حکیم علوی خاں دہلوی

از

جناب حکیم محمد زماں صاحب سیفی حسینی

ہندوستان کے اطبا میں ایسے چند ہی طبیب گذرے ہیں ، جو اپنی ذات میں بجائے ایک فرد کے انجمن تھے ، ان ہی میں ایک ذات گرامی حکیم علوی خاں کی ہے ،

نام و نسب ان کا نام محمد ہاشم ہے ، والد کا اسم گرامی ہادی ، دادا کا مظفر الدین ہے ، اصل باشندہ شیراز کے ہیں ، شیراز ہی میں ۱۰۸۰ھ رمضان المبارک میں ولادت ہوئی ،

تعلیم جملہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل شیراز ہی میں وہاں کے اکابر علما سے کی ، فن طب اپنے والد سے حاصل کیا ، اور ان ہی کے مطب میں عملی مہارت و تجربہ میں درجۂ کمال تک پہونچے ،

سفر ہند ۱۱۱۱ھ میں دار الحکومت دہلی میں ان کا ورود ہوا ، اس وقت ان کی عمر کل اکتیس سال کی تھی ، گویا عہد جوانی تھا ، بادشاہ وقت اورنگ زیب عالمگیر نے پذیرائی کی ، اور خلعت شاہی سے نوازا ، اور اپنے بیٹے محمد اعظم بن عالمگیر کے ساتھ کر دیا ، اس کے قتل کے بعد اس کے بھائی ، شاہ عالم بن عالمگیر نے ان کو اپنا مصاحب و مقرب بنا لیا ، اور ان کے فضل و کمال کے اعتراف کے طور پر "علوی خاں" کا خطاب عطا کیا ، اور اپنے خصوصی مشیروں میں انھیں خاص درجہ دیا ،

اس کے عہدِ سلطنت میں علوی خاں برابر درجہ بدرجہ ترقی کرتے رہے، محمد شاہ کا دور آیا، تو اُس نے بھی ان کو اپنا خاص مصاحب بنایا، اور ان کو معتمد الملوک کا خطاب عطا کیا، اور اب وہ حکیم محمد ہاشم کے بجائے معتمد الملوک حکیم محمد ہاشم علوی خاں" کے معزز لقب سے مشہور ہوئے، بعد کو عوام نے "نواب" کا اس میں اضافہ کر دیا،

محمد شاہ نے اسی پر بس نہیں کیا، ان کا پچھلا منصب شاہی بڑھا کر شش ہزاری منصب پر انھیں فائز کیا، اور تین ہزار روپئے نقد ماہوار وظیفہ مقرر کیا، اس اکرام و اعزاز کے ساتھ حکیم صاحب کی زندگی گذر رہی تھی کہ نادرشاہ کی دہلی میں آمد ہوگئی، وہ علوی خاں کو باصرار اپنے ساتھ ایران لے گیا،

نادرشاہ نے دہلی میں حکیم صاحب سے وعدہ کیا تھا، کہ وہ ان کو حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے اپنے خرچ سے بھیجے گا، ایران پہونچ کر نادرشاہ نے یہ وعدہ پورا کیا، اور حکیم صاحب کو اعزاز و اکرام کے ساتھ سفر حرمین شریفین پر روانہ کیا، اور وہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے، مگر حکیم علوی خان کے دل میں ہندوستان کی محبت و کشش ایسی جاگزیں تھی، کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد ایران جانے کے بجائے پھر دہلی واپس آئے، یہ واقعہ سنہ ۱۱۵۶ھ کا ہے،

دہلی پہونچکر بدستور اپنے علمی مشاغل درس و تدریس اور علاج و معالجہ میں مصروف ہوگئے، اور مخلوقِ خدا کو اُن کی ذات سے فیض پہنچنے لگا، پانچ سال کے بعد حکیم صاحب کو شدید قسم کا مرض استسقا لاحق ہوگیا، ہر چند بہتر سے بہتر تدبیریں کی گئیں، مگر شفا نہیں ہوئی، اور حکیم صاحب نے اسی مرض میں وفات پائی، سنہ وفات کے متعلق دو روایتیں ہیں،

(۱) صاحب بیان الوقائع نے سنہ ۱۱۶۰ھ ماہ رجب تحریر کیا ہے،

(۲) اور صاحب مہرجہان تاب نے رجب سنہ ۱۱۶۲ھ،

"بر فلک رفت مسیحائے جدید" مادۂ تاریخ ہے، وصیت کے مطابق حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیا کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

علی اختلاف القولین حکیم علوی خاں کی عمر اسّی یا بیاسی سال ہوئی،

تصنیفات حکیم صاحب نے اپنے پیچھے نہایت ہی مفید اور اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو ایک زمانہ تک مخلوقِ خدا کو فیوضِ علمی سے بہرہ ور کرتی رہیں، مگر اب یہ تمام کتابیں نا پید ہیں، مگر بعد کے اربابِ فن نے اپنی اپنی کتابوں میں حکیم صاحب کی جستہ جستہ عبارتیں نقل کرکے ان ذخائرِ علمی کا خلاصہ محفوظ کر دیا ہے، اس طرح آج بھی علوی خاں کے علمی فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہے، اور شائقین علم اس سے مستفید ہو رہے ہیں،

مندرجہ ذیل کتابیں اُن کی تصنیفات میں شمار کی جاتی ہیں،

(۱) - شرح ہدایۃ الحکمۃ للمیبذی پر مفید حاشیہ،

(۲) تحریر اقلیدس کی شرح۔

(۳) مجسطی کی شرح۔

(۴) موجز القانون کی شرح،

(۵) شرح اسباب و علامات پر قیمتی حواشی،

(۶) احوال اعضاے نفس پر ایک کتاب،

(۷) فن موسیقی پر ایک رسالہ،

(۸) التحفۃ العلویہ والایضاح العقلیہ،

(۹) جامع الجوامع، صاحب نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں:- فن طب میں اس کی مماثل دوسری کتاب نہیں ہے، (نزہہ) صاحب اکسیر اعظم نے کتاب کا نام بجائے جامع کے جمع الجوامع لکھا ہے، اور اپنی کتاب اکسیر اعظم میں اس سے استفادہ کیا ہے، دیباچہ میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، لیکن رموز اعظم میں قرابادین جمع الجوامع لکھا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ادویۂ مرکبہ کی یہ کتاب جامع قرابادین ہے،

(۱۰) آثار باقیہ، یہ کتاب بھی فن طب میں ہے، صاحب نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں کہ ترکیب ادویہ کے بیان میں یہ کتاب حکیم علوی خاں کی عظمت علمی کے لئے "دلائل الاعجاز" کی حیثیت رکھتی ہے، (نزہتہ الخواطر)

(۱۱) عشرۂ کاملہ - اس کتاب کا تذکرہ صرف حکیم محمد اعظم خاں نے اکسیر اعظم جلد اوّل کے دیباچہ میں کیا ہے، یہ بھی فن طب کی کتاب ہے،

(۱۲) قرابادین علوی خانی، فن طب میں ہے، (دیباچۂ اکسیر اعظم)

(۱۳) بیاض علوی خاں طب میں، (علاج الامراض ص ۱۸)

یہ ان کتابوں کی فہرست ہے جو بالکل نایاب ہیں، میری نظر سے دو اور ایسی کتابیں گذری ہیں جو کہ ان کی جانب منسوب ہیں، مگر میری تحقیق یہ ہے کہ ان میں سے ایک تو قطعی ان کی نہیں ہے، اور دوسری کا ان کی جانب انتساب مشکوک ہے،

(۱) خلاصتہ التجارب، یہ کتاب فارسی میں طب کے ایسے علمی و فنی معلومات پر مشتمل ہے جس سے مصنف کی علمی عظمت کا پتہ چلتا ہے، اس کتاب میں مریضوں کے ایسے حکایات احوال بھی مذکور ہیں، جو طب کے طلبہ کے لئے رہنمائی کا کام دیتے ہیں، نولکشور پریس کانپور کی طبع شدہ ہے، میرے پیش نظر نسخہ اخیر سے ناقص ہے، اندازہ ہے کہ ضائع شدہ

حصہ دو ورق سے زیادہ نہیں ہوگا جس میں طبی اوزان وغیرہ کا بیان ہے، اس لئے کہ پیش نظر کتاب کی آخری سطروں میں درج ہے کہ "باب بست وپنجم در بیان بعضے الفاظ غریبہ کہ متعارف اطبا است" "و اوزان مذکورہ در طب خصوصاً آنچہ دریں کتاب آورده شده"،

اس کے قبل بالترتیب اور کتب طب کی طرح جن مسائل کے بیان پر کتابیں ختم ہوتی ہیں، یہ بھی اسی طرح ختم ہوئی ہے، مسائل فن کے بعد اوزان کی بحث ہوتی ہے، جو ایک مختصر دو ورقی مسئلہ ہے، اس قرینہ کی بنا پر میرا خیال ہے، کہ زیادہ سے زیادہ دو ورق اخیر سے ضائع ہوئے ہیں، جو حصہ موجود ہے، وہ چھ سو چھبیس صفحات ۱۸/۲۰ ڈبل کراؤن سائز پر مشتمل ہے، کتاب کے لوح پر سنہ طباعت درج نہیں ہے، ممکن ہے اخیر کتاب میں ہو جو شکستہ ورق کے ساتھ ضائع ہو گیا،

اسی طرح خاتمہ کتاب میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا علم نہیں ہو سکا، شروع کتاب میں اس زمانہ کے دستور کے مطابق حمد نعت، مصنف کا نام سنہ تصنیف وغیرہ کا ذکر ہے، لوح کتاب پر پریس کی جانب سے درج ہے "مجربات حکیم علوی خاں دہلوی موسوم بخلاصتہ التجارب" اسی کتاب کا ایک اشتہار مطبوعہ نولکشور کی ایک کتاب مطب علوی خاں کے کور پر اس طرح درج ہے،

"خلاصتہ التجارب، مجربات طبیہ حکیم علوی خاں مدونہ حکیم بہاء الدولہ بہادر"

اس اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب حکیم بہاء الدولہ کی سعی کا نتیجہ ہے، اور مضامین علوی خان کے ہیں، لیکن درحقیقت واقعہ اس کے خلاف ہے، اس کی کئی وجہیں ہیں،

۱- دیباچۂ کتاب میں بحیثیت مصنف بہاء الدولہ کا نام درج ہے، اس میں اشارۃً کنایۃً بھی اس کا تذکرہ نہیں، یہ کتاب ان معلومات طبیہ پر مشتمل ہے، جو حکیم علوی خاں کے

فیض کا ثمرہ ہیں" اور وہ صرف جامع اور مرتب ہیں،

(۲) بلکہ حکیم بہار الدولہ نے اس کے برعکس یہ لکھا ہے، کہ "ایں بیچارہ را بعضے از تجارب طبی گذشتی است بر فوائدِ بدنی حاصل بود" جو اس کا ثبوت ہے، کہ یہ مجموعہ خود ان کے ذاتی مجربات کا مجموعہ ہے،

(۳) حکیم بہار الدولہ نے دیباچہ کتاب میں سالِ تصنیف ۹۰۷ھ ہجری کی تصریح کی ہے "ایں رسالہ موسومہ بخلاصۃ التجارب در اوان سنۃ سبع و تسعمائۃ" اور حکیم علوی خاں اُس کے ایک سو بہتر سال بعد ۱۰۸۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے، (ولد بُشیراز فی شہر رمضان سنۃ ثمانین والف) ایسی صورت میں اس کا انتساب حکیم علوی خاں کی جانب کیسے درست ہو سکتا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس حقیقت کے باوجود لوحِ کتاب پر نولکشور پریس کی جانب سے علوی خاں کے نام کی صراحت موجود ہے، جس سے بعض اربابِ علم کو بھی تو اس کتاب کے بارے میں دھوکہ ہو گیا ہے، چنانچہ مشہور فاضل اور بالغ نظر مصنف حکیم علی احمد نیر واسطی نے اپنے رسالہ نباض کے ایک شمارہ میں اور حکیم کوثر چاند پوری نے اپنی کتاب "اطباءِ عہدِ مغلیہ" میں خلاصۃ التجارب کو علوی خاں کی کتابوں میں شمار کیا ہے، لیکن یہ خوشی کی بات ہے، کہ مشہور طبیب اور مصنف حکیم محمد اعظم خاں، رامپوری مرحوم کو یہ مغالطہ نہیں ہوا، انھوں نے اکسیر اعظم کے دیباچہ میں کتب ماخذ کے فہرست کے سلسلہ میں خلاصۃ التجارب کا بھی تذکرہ کیا ہے، مگر کتاب کی نسبت میر بہاء الدین کی طرف کی ہے، جن کا لقب "بہاء الدولہ" ہے، حکیم صاحب نے علوی خاں مرحوم کی جانب اس کی نسبت نہیں کی ہے،

(۴) مطب علوی خاں۔ یہ ۹ صفحات کا ایک مختصر طبی رسالہ ہے، جس میں معمول مطب نسخہ جات درج ہیں، نولکشور پریس کانپور میں چھپا ہے، میرے پیش نظر ۱۹۱۰ء کا

چھٹا اڈیشن ہے، اس کے اخیر میں ۵ صفحات کا ایک رسالہ مسئلہ بحران پر مصنفہ حکیم علی حسین مرحوم لگا ہوا ہے، مطب علوی خاں میں اس موضوع کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں کوئی خاص ندرت علمی نہیں ہے، جس سے مصنف کتاب کے بارے میں، کوئی خصوصی علمی تصور قائم کیا جائے، عجیب بات یہ ہے، کہ شروع رسالہ میں نہ کوئی تمہید ہے، نہ حمد و نعت ہی، اور نہ مصنف ہی کا نام مذکور ہے، اخیر میں بھی نہ کوئی خاتمہ، نہ کلمۂ خاتم، نہ نام مصنف، اسی طرح کتاب کے مضامین میں بھی کہیں نہ مصنف کا نام ملتا ہے، نہ کسی شاگرد کا، البتہ صفحہ پانچ پر دو جگہ یہ درج ہے،

(۱) ضماد مستعمل حضرت قبلہ گاہی صاحب (۲) دوا معمول قدوۃ الاطباء والد ماجد

ان دونوں عبارتوں سے شخصیت کی تعیین مشکل ہے، البتہ نولکشور پریس کی طرف سے لوحِ کتاب پر۔ مطب علویخاں تحریر ہے، میرا خیال ہے کہ پریس سے اس رسالہ کے انتساب میں بھی غلطی ہوئی ہے، اس خیال کو اس قرینہ سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ حکیم محمد اعظم خاں مرحوم جیسا وسیع النظر محقق اپنی تصنیفات کے "کتب آخذ" میں کہیں بھی مطب علوی خاں کا تذکرہ نہیں کرتا، جب کہ علوی خان کی دوسری کتابوں کا ذکر کیا ہے، بلکہ اُن کی بعض غیر مشہور کتابوں تک کا پتہ دیا ہے، مثلاً عشرہ کاملہ، بلاشبہ عدم ذکر سے عدم نفی گو لازم نہیں آتا، مگر حکیم محمد اعظم خاں کی نظر سے علوی خاں کی کسی معتبر کتاب کا اوجھل رہنا بظاہر ناقابلِ یقین ہے، اس لئے اپنے خیال کی تائید کا اس کو قرینہ ضرور سمجھتا ہوں، البتہ حکیم محمد اعظم خان مرحوم نے اکسیر اعظم کے دیباچہ ص ۱۵ میں حکیم علوی خان کے شاگرد حکیم میر حسن صاحب کی ایک کتاب مطب میر حسن، کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے کہ اس کو پریس والوں نے مطب علوی خاں کے نام چھاپ دیا ہو، اس لئے مطب علوی کی صحتِ انتساب

مشکوک ہے،

حکیم علوی خاں مرحوم نے ان بیش قیمت کتابوں کے علاوہ لائق و فائق تلامذہ کا بھی ایک بڑا حلقہ چھوڑا ہے، ان سے مخلوقِ خدا کو جو فیض پہنچا اس کا حصّہ بھی حکیم علوی خاں کے نامۂ اعمالِ خیر میں درج ہوگا،

ان تلامذہ میں سے صرف چند کے نام مجھے معلوم ہو سکے،

(۱) حکیم نور اللہ صاحب مرحوم مصنّف انوار العلاج،

(۲) حکیم ثناء اللہ صاحب مصنّف طب اثنا ئی، ساکن بریلی،

(۳) حکیم میر حسن صاحب مرحوم مصنّف "مطب میر حسن"

(۴) حکیم اسد علی مرحوم

حکیم محمد اعظم خاں رام پوری مرحوم نے اکسیر اعظم رموز اعظم کے دیباچوں میں اسماء اطباء کے عنوان سے ان کا ذکر کیا ہے، تلاش سے ان ناموں میں اور اضافہ ہو سکتا ہے،

یہ ان شاگردوں کے نام ہیں جنھوں نے براہِ راست حکیم علوی خاں مرحوم کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا ہے، ایسے تلامذہ جو ان کے شاگرد در شاگرد کے سلسلۂ تعلیم سے وابستہ ہیں ان کا حلقہ بہت وسیع ہے، اور ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے طبی خانوادے علوی خاں کے فیوضِ طبی کے خوشہ چیں ہیں، خاندانِ اجملی دہلوی کے مورثِ اعلیٰ حکیم محمد شریف خاں جو خود استاذ الاساتذہ ہیں، اور حکیم محمد اعظم خاں رامپوری صاحبِ اکسیر اعظم وغیرہ اور حکیم اعظم خاں رام پوری مرحوم کے بھانجے حکیم نجم الغنی اور دیگر قابلِ ذکر اطبا، حکیم علوی خاں مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہیں،

علوی خاں کے بعد ہر محقق و مصنف نے اپنی طبی تصنیفات میں حکیم علوی خاں کے مجربات

و معمولات سے استفادہ کیا ہے، اس طرح اس بلبلِ شیراز نے دبستانِ ہند کو اپنی علمی نغمہ سرائیوں سے ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا،

اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب پیش نظر تھیں،

(۱) نزہۃ الخواطر مصنفہ حکیم عبدالحئی لکھنوی مرحوم ج ۶ ص ۲۰۴،

(۲) اکسیر اعظم جلد اوّل ص ۵،

(۳) رموز اعظم جلد اول ص ۳،

(۴) علاج الامراض مصنفہ حکیم محمد شریف خاں دہلوی ص ۱۸

(۵) شرح اسباب و علامات یوسفی لکھنؤ،

(۶) خلاصۃ التجارب،

(۷) مطب علوی خاں،

(۸) اطباء عہد مغلیہ، کوثر چاند پوری،

(۹) رسالہ نباض لاہور حکیم نیر واسطی،

تلخیص و تبصرہ

عُمان

"عمان شرق اردن میں ایک چھوٹی سی عرب ریاست ہے، سلطان قابوس یہاں کے حکمراں ہیں، عرب دنیا کی سیاست میں عمان کا نام بھی آتا ہے، اُس کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے، حال کے ایک عرب سیاح نے اُس کے چشم دید حالات لکھے ہیں جو مفید معلومات پر مشتمل ہیں، اس لئے اُس کی تلخیص دی جاتی ہے"

اسلامی ممالک میں عمان غیر متمدن اور قدامت پسند ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہاں صدیوں تک خارجیوں کا تسلط رہا، جو بالعموم اباضی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن اب عمان شرق اردن کا دارالحکومت ہے، اور سیاسی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے ایک مسقط اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ دوسرا عمان جو اندرون ملک کے علاقوں پر مشتمل ہے، اور اب اس پر ہاشمی خاندان حکومت کرتا ہے، خارجیوں کا تسلط صدیوں پہلے ختم ہو چکا ہے،

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں عمان بالخصوص اس کے ایک خوبصورت شہر نزوی کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کیا ہے، کہ عمان سرسبز و شاداب نہروں درختوں کھجوروں کے باغات اور مختلف قسم کے پھل پھلواریوں پر مشتمل ہے جس کا ایک شہر نزوہ پہاڑ پر آباد ہے جو باغات سے گھرا ہوا ہے، یہاں کے لوگ بڑے باہمت اور بہادر ہیں، ان میں اکثر

آپس میں جنگیں رہتی ہیں، اس کے ساتھ بڑے خلیق اور عربوں جیسے مہمان نواز بھی ہیں، یہ اُن کی عادت میں شامل ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں قریب کی کسی مسجد میں لاکر کھاتے ہیں، اور اس میں ہر وارد و صادر کو شریک کرتے ہیں، اُن کے دسترخوان پر پالتو گدھے کا گوشت بھی ہوتا ہے، اور بازاروں میں عام طور پر فروخت ہوتا ہے، کیونکہ یہاں کے لوگ اس کو حلال سمجھتے ہیں، ان کا بادشاہ عرب کے مشہور قبیلہ ازد بن الغوث کا ہے، جو اپنے مکان کے سامنے دربار منعقد کرتا ہے، نہ کوئی حاجب اور وزیر ہوتا ہے، اور نہ کسی کے آنے سے روکا جاتا ہے، بادشاہ خود شکایتیں سنتا اور فیصلہ کرتا ہے،

ابن بطوطہ سے تقریباً ایک صدی قبل عرب کے ایک دوسرے سیاح یاقوت حموی کا اس شہر میں گذر ہوا تھا جس نے یہاں کی پارچہ بافی کی تعریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ اس قسم کے ریشم کے کام اور زربافی کی مثال دوسرے عرب ملکوں میں نہیں ملتی، لیکن یہ کپڑے بہت گراں فروخت ہوتے ہیں،

یہ تو چھ سو سال پہلے کا عمان تھا، لیکن آج بھی وہاں قدامت پسندی کے ساتھ ساتھ غربی جہالت اور بدحالی بدستور قائم ہے، اور صدیوں پہلے کا عمان آج بھی وہی عمان ہے، قدامت پسندی اور بے کاری نے اُس کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے، زرخیز زمینوں نہروں اور وادیوں کے باوجود اب تک اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا، عمان کی سرحد سے مغرب جانب نزوی کی سمت میں شمالی مغرب کے پچاس کیلومیٹر کے بعد تقریباً ڈھائی سو کیلومیٹر کا وسیع اور سرسبز و شاداب علاقہ جو وادی سمایل کے نام سے مشہور ہے، بالکل بیکار پڑا ہوا ہے، اور دور دور تک آبادی

کانام ونشان نظر نہیں آتا، کسی زمانہ میں یہاں آبادیاں تھیں، جن کے نشانات آج بھی
جابجا ملتے ہیں، لیکن اب ان آبادیوں کی جگہ خاردار درخت اور بوسیدہ مکانات
کے ٹیلے، اور قابلِ کاشت افتادہ زمینیں ہیں، جو انسانی قدم کی منتظر ہیں، اگر ان
طویل وادیوں میں انسانی آبادی کے نشانات ملتے بھی ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے
گاؤں ہیں، جو میلوں کے بعد ایک دو نظر آجاتے ہیں، اُن کے مکانات اس قدر
خستہ ہیں کہ ان سے ویرانی برستی ہے، مٹی کے کچے مکانات ہیں، جن کی چھتیں کھجور
کی پتیوں اور ٹہنیوں پر قائم ہیں، یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، جہاں میٹھے
پانی کی نہروں اور باصلاحیت زمینوں کی کثرت کے باوجود وہاں کے لوگ غربت
کی زندگی گذار رہے ہیں،

سمائل کی سرسبز وشاداب وادیاں اپنی خوبصورتی اور زرخیزی کے اعتبار سے
بے مثال ہیں، جگہ جگہ صاف وشفاف پانی کے چشمے، گھنے سایہ دار درخت اور بلند
پہاڑوں پر پھیلے ہوئے باغات نہایت دلکش منظر پیش کرتے ہیں، یہاں کی شاعری
میں سمائل کی وادیوں کا ذکر ضرور آتا ہے، یہ وادیاں فطری حُسن کے ساتھ اپنے
دامن میں تاریخی واقعات بھی رکھتی ہیں، بڑے بڑے علماء، صوفیہ، اور امراء اکابر
کی یادیں ان سے وابستہ ہیں، یہاں کی روایت کے مطابق عمان میں دعوتِ اسلام
پہنچنے سے قبل سمائل ہی کے ایک شخص مازن ابن غضوبہ السعدی نے مدینہ جاکر آنحضور
صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا تھا، یہاں کے والی نے اس سوال کے
جواب میں کہ کیا یہاں کے سبھی لوگ کاشت کرنا جانتے ہیں، بتایا کہ ہر شخص تو
زراعت نہیں کرتا، عموماً یہاں کے باشندے کویت سعودی عرب بحرین زنجبار

اور عدن وغیرہ ملکوں میں رہتے ہیں، اور وہیں ملازمت اور دوسرے پیشوں کے ذریعے
اپنی زندگی گذارتے ہیں

یہی حال پورے عمان کا ہے، تمام شہروں خصوصًا دیہی علاقوں کی اقتصادی
ومعاشی حالت کا انحصار زراعت اور کاشت پر ہے، ان کی اکثریت کاشتکار ہے
لیکن زراعت کے جدید آلات اور کیمیاوی کھاد سے ناواقف ہونے کی وجہ سے
زراعت میں کامیاب نہیں ہیں، اور جہاں صدیوں پہلے تھے، وہیں آج بھی ہیں، وہ
قدامت پسندی کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے، اور اپنے آباواجداد کے
طریقے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، بونے جوتنے کے لئے وہی پرانے ہل اور کدال
استعمال کرتے ہیں،

ملکی پیداوار کی کمی کی وجہ سے بیرونی برآمد بہت کم ہے، چیزیں انتہا گراں ہیں جنکو
ایک معمولی شخص جو کاشت نہ کرتا ہو، نہیں خرید سکتا، عمان کی اقتصادی بدحالی اور غربت
نے وہاں کے لوگوں کو دوسرے ملکوں میں ملازمت کرنے پر مجبور کردیا ہے، عمان میں
دو کروڑ آبادی کی گنجائش ہے، مگر موجودہ آبادی بیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہے، ان کا
بڑا حصہ بھی دوسرے ملکوں میں رہتا ہے، عمان میں طرح طرح کی متعدی بیماریاں پھیلی رہتی
ہیں، عموماً لوگ آنکھوں اور دانتوں کے امراض میں مبتلا رہتے ہیں، سل اور ملیریا کی بیماریاں
وبائی طور پر پھیلی رہتی ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ آبادیوں میں گندگی بکثرت ہے، صفائی کا معقول
انتظام نہیں ہے، سمائل کے ایک حاکم نے بتایا کہ صفائی کے انتظامات کی ذمہ داری وزارت
صحت پر ہے جو بہت تھوڑے علاقوں میں محدود ہے، اس کے اخراجات وزارتِ اوقاف برداشت
کرتی ہے، جہاں صفائی کا کچھ انتظام ہے، وہ بھی ناقابلِ اطمینان ہے، ہر جگہ سڑکوں اور بازاروں

میں گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں، ان گندگیوں کی وجہ سے آئے دن وبائی امراض پھیلتے رہتے ہیں، خصوصاً نزوی کے باشندے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اتنے بڑے شہر میں طبیبوں کی کمی ہے، اور کوئی ایسا سول اسپتال نہیں ہے جو یہاں کے شہریوں کے لیے کافی ہو، ایک ہندوستانی طبیب بڑی محنت اور دلچسپی سے مطب کرتے ہیں، ان کو وزارت صحت کی طرف سے سہولتیں بھی ملی ہوئی ہیں، جن میں ایک پختہ عمارت بھی شامل ہے، جو اس شہر کا گویا اسپتال ہے، انھوں نے بتایا کہ یہاں آنکھوں کی بیماریاں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہیں، سل، ملیریا، اور اسہال کا مرض عام طور پر ہوتا ہے، ایسی حالت میں یہاں کم سے کم دس بارہ اطبا کی ضرورت ہے، اس لیے کہ نزوی عمان کا مرکزی شہر ہے جہاں دوسرے مقامات کے مریض بھی پہنچتے رہتے ہیں،

عمان میں تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا، بچوں کی ابتدائی تعلیم عموماً کھجور کے باغوں میں کسی معلم کی سرپرستی میں ہوتی تھی، جو معلم کے لیے وقف ہوتا تھا، مگر ادھر چند سالوں سے کئی مدرسے قائم ہو چکے ہیں، اس وقت نزوی میں تقریباً پانچ مکاتب قائم ہیں، ان مکاتب میں گذشتہ سال سات سے سترہ سال تک کی عمر کے تقریباً پانچ سو طلبہ داخل ہوئے، اسی طرح سمایل میں متعدد ابتدائی مدرسے قائم ہیں، جن میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم عصریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے حکومت بھی اس میں دلچسپی لے رہی ہے، چنانچہ سمایل کی ایک نامور شخصیت شیخ سعود خلیلی کو تمام عمان کے مدرسوں کا ذمہ دار بنا دیا گیا ہے، جنھوں نے عمان کی تعلیمی مہم کے لیے مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا ہے، اب آئندہ سال عمان

کے مختلف حصوں میں بیالیس مدرسوں کے قیام کا منصوبہ ہے، جن میں دس لڑکیوں کے لیے خاص ہوں گے،

عمان کے بڑے شہروں میں نزوی، فہود، میناء الفحل اور صحارا مشہور ہیں، صحارا ساحلی علاقہ ہے، اور عمان کا سب سے زیادہ متمدن اور خود کفیل شہر شمار کیا جاتا ہے، یہ تاریخی بندرگاہ بھی ہے، جہاں سے چینی تجارتی سامان درآمد برآمد ہوتا تھا، اس لیے اس کو خزانۂ شرق بھی کہتے ہیں، ابو اسحاق اصطخری نے اس کو بلاد اسلامیہ میں سب سے زیادہ متمول اور تجارتی بندرگاہ بتایا ہے، آج بھی یہ بہت آباد اور پر رونق اور ساحل باطنہ کے تمام علاقوں میں ممتاز ہے یہاں کا ذریعہ معاش زراعت، مچھلی اور موتیوں کی تجارت ہے،

میناء الفحل بھی ساحلی علاقہ ہے، اور عمان کے تیل کا سب سے بڑا اسٹیشن ہے، فہود میں تیل کی دریافت کے بعد سے روز بروز آبادی بڑھتی جا رہی ہے اور جدید طرز کے مکانات بنتے جا رہے ہیں،

عمان میں تیل کی دریافت اس کی ترقی کا پہلا زینہ اور اس کی اقتصادی تاریخ میں بہت بڑا انقلاب ہے، فروری ۱۹۵۴ء میں ماہرین ارضیات کی ایک جماعت نے الربع الخالی کے نشیبی علاقوں میں تیل کی تلاش شروع کی اور اسی سال اکتوبر میں پٹرولیم کی تلاش کے لیے کھدائی بھی شروع ہو گئی، لیکن چھ مہینہ کی مسلسل جد و جہد کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اس مدت میں چار کنوئیں کھودے گئے، جن پر ایک کروڑ بیس لاکھ اسٹرلنگ صرف ہوا، بالآخر اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے پانچ کمپنیوں نے آپس میں معاہدہ کیا، لیکن اس کام میں ناکامی کے بعد ان میں سے

تین کمپنیوں نے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا، جن میں فرانس کے ساتھ برطانیہ کی بی، پی
اور نیو جرسی کی اسٹنڈرڈ موبل کمپنی شامل تھے، باقی دو کمپنیوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں
اور فروری ۱۹۶۴ء میں گذشتہ کنوؤں سے کچھ دور ہٹ کر کھدائی شروع کی، اس مرتبہ
تیل کا بہت بڑا چشمہ ابل پڑا، اب یہ تیل کا ذخیرہ شیل اور بارٹیکس کے ٹھیکہ میں ہے،
جس میں شیل کی کمپنی ۸۵ فی صد کی حصہ دار ہے، اور دوسری پندرہ فی صد کی، موجودہ
چشمے تین لاکھ تیس ہزار ڈرام یومیہ تیل حاصل ہوتا ہے، جب کہ ۱۹۶۷ء میں اسکی رفتار
ایک لاکھ چالیس ہزار ڈرام تھی، فی الحال فہود سے حلوتک تین سو کیلو میٹر کے پائپ پھیلا
دیے گئے ہیں، اور دوسرے چشموں کی تلاش جاری ہے، اس طرح عمان بہت جلد خود کفیل
ہو جائے گا اور اس کی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی، یہاں کی حکومت نے شفاخانوں
اسکولوں اور سڑکوں کے بنانے کا پروگرام بنایا ہے، اور حتی الامکان ترقی
کے لیے کوشاں ہے، چنانچہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے دو بڑے پیمانہ پر ہوٹل بن چکے
ہیں اور دیگر تعمیری کاموں میں ہاتھ لگا ہوا ہے، دو رسالے بھی شائع ہوتے ہیں جو ملک
کی ذہنی تعمیر اور سیاسی مباحث میں حصہ لیتے ہیں، دوسرے ملکوں میں سرکاری سطح پر
خیرسگالی کے لیے وفد بھی بھیجے جا رہے ہیں، جن کے ابتک اثرات ملک کی تعمیر اور استحکام
کے لیے مفید ثابت ہوئے ہیں، عمان کے ایک حاکم نے اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے
بڑے وثوق سے کہا کہ ہم جن مشکلات سے دوچار ہیں، دنیا کو اس کی
خبر نہیں، لیکن آیندہ پانچ سال کے اندر ہم وہ نہیں رہیں گے جو آج ہیں،

مکتوب حمید

از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس

پیرس کے رومانی کلیسا کے ایک پادری کرنسٹان ورتزیل جارج نے
فرانسیسی زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب لکھی
تھی، اس کا ترجمہ فارسی میں ہوا تھا، فارسی سے مولانا وارث علی ایم، اے
فاضل دیوبند نے اردو میں منتقل کیا، مئی ۱۹۷۱ء میں معارف میں اس پر
ریویو ہوا، اس میں مترجم نے مصنف کا جو تعارف اور کتاب کے متعلق جو
رائے لکھی تھی، ریویو میں اس کو نقل کر دیا گیا تھا، اور کتاب میں جو غلطیاں
نظر آئی تھیں، ان کو ظاہر کر دیا تھا،

مشہور فاضل ڈاکٹر حمید اللہ کتاب کے مصنف سے پوری طرح واقف ہیں
اور فرنچ میں اصل کتاب ان کی نظر سے گذر چکی ہے، ان کے بارہ میں انکی رائے
اس سے بالکل مختلف ہے، جو اردو کے مترجم نے ظاہر کی ہے، اس لیے ان کی
نظر سے جب معارف کا ریویو گذرا تو انھوں نے مصنف اور تصنیف کی اصل
حقیقت لکھ کر بھیجی،

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے جن قابل اعتراض باتوں کی
طرف اشارہ کیا ہے، ان کو فارسی کے مترجم نے حذف کر دیا تھا، یہ کتاب

ہماری نظر سے گذری ہے، بعض غلطیوں کے سوا جن کی مترجم نے حاشیہ میں تصحیح و
تردید کردی ہے، کوئی اہم قابل اعتراض بات نظر میں نہیں آئی، مصنف کے
متعلق اردو کے مترجم کو فارسی ترجمہ سے جو حالات معلوم ہوئے، وہی انھوں نے
اپنے مقدمہ میں نقل کردیے، اس لیے وہ اس میں بھی بے قصور ہیں، لیکن ڈاکٹر
حمید اللہ صاحب کے سامنے اصل فرانسیسی کتاب ہے، اور مصنف کے حالات سے
پوری طرح واقف ہیں، اس لیے ان کا بیان بھی صحیح ہے، بہرحال ان کے
خط سے دونوں کے متعلق غلط فہمیوں کی تصحیح ہوتی ہے، اس لیے ان کا خط
شائع کیا جاتا ہے۔ م

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مئی کا رسالۂ معارف آج ۲۹ رجولائی کو یہاں پہنچا، سارے کام چھوڑ کر اس کا
مطالعہ کیا، چشم بددور۔

اگر اجازت مرحمت ہو تو عرض کروں کہ مطبوعاتِ جدیدہ کی تنقید میں "پیغمبر اسلام"
مترجمہ وارث علی صاحب کے متعلق "ض" کے معلومات اصلاح طلب ہیں،

وہ ژیل جارج کا صحیح تلفظ ورجیل گیورگیو ہے، یہ نہ کبھی مسلمان ہوا اور نہ بائیس
سال کے مطالعہ وتحقیق" کے بعد یہ کتاب لکھی، یہ شخص ابھی زندہ ہے، پیرس میں رومانوی
کلیسا میں پادری اور راہب ہے، زندگی افسانہ نویسی میں گذری اور کئی ناولوں پر
ادبی انعام بھی ملے، سیرت نبویہ پر بھی ایک افسانہ لکھا ہے، اور غالباً بائیس ہفتوں
میں ذکر بائیس سال میں۔

مولف کی دیانتداری کا اس سے اندازہ لگایا جائے کہ اسے عربی رسم الخط بھی نہیں
آتا، لیکن کتاب میں عربی کتابوں کے راست حوالوں میں نہ صرف مطبوعات ہیں بلکہ ایسے
مخطوطات بھی جن کا دنیا میں صرف ایک نسخہ ہے اور مولف نے ان کی کبھی صورت بھی
نہیں دیکھی،

پیرس کے ایک مسلمان نے مولف ہی کی درخواست پر کتاب کی تاریخی
اغلاط کی ایک فہرست مرتب کردی جو ۳۲ صفحوں میں تھی، چند ماہ بعد مولف نے ایک اخبار
میں ایک مضمون اپنی کتاب کی تعریف اور خلاصے میں چھاپا اور اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ
فلاں فاضل وممتاز مولف نے اس کتاب کو غور سے دیکھکر اس میں جو غلطیاں پائیں
وہ "نہایت قلیل وحقیر صرف املا کی غلطیوں پر مشتمل ہیں"۔

مولف کا انداز یہ ہے کہ کسی انتہائی نامناسب (اور غلط) چیز کا رسول اکرمؐ کی طرف
انتساب کرے، پھر اس کی تائید میں کہے: "مگر وہ اللہ کا پیغامبر تھا، اسے قطعاً حق تھا کہ
جو چاہے کرے"۔ انتہائی فحش اور باجی پن کی چیزیں بھی اصل کتاب میں ہیں،

چونکہ شکر میں لپیٹ کر اسلام اور رسول اکرمؐ کے متعلق رکیک باتیں لکھی گئی ہیں
مشنری اس کتاب کو خوب پھیلا رہے ہیں، اور ہمارے بھولے مسلمان بھی نادانستہ
اس کے ترجمے کرکے (جو ممکن ہے، حذف واضافہ وتحریف کے بعد ہی ہوں) اس گناہ
میں شریک ہو رہے ہیں۔

اگر مناسب ہو تو اسے بھی چھاپ دیجئے

المفتقر الی اللہ

محمد حمید اللہ

ادبیات

بیانِ حقیقت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

ماہ و انجم سے پرے فکرِ بشر جاتی ہے
عقل اور دل کے جہاں جلتے ہیں پر جاتی ہے

سقفِ افلاک سے بھی ہو کے گذر جاتی ہے
کیا بتاؤں میں کہاں تک یہ نظر جاتی ہے

منزلِ شوق کو جو راہ گزر جاتی ہے
اپنے دامن میں لیے تحفۂ سر جاتی ہے

کیا خبر آتی ہے کس سمت سے یہ جوئے حیات
کیا پتہ ہو کے یہاں سے یہ کدھر جاتی ہے

خنجر و تیغ سے بھی جو نہیں سکتا ہے کبھی
ایک معصوم نظر کام جو کر جاتی ہے

جو ہر ذات مصائب سے نہیں ہوتے فنا
خاک میں ملنے سے کب آب گہر جاتی ہے

آبروئے دل کی بہت ہم نے بچائی تھی مگر
اب وہ تیرے سبب اے دیدۂ تر جاتی ہے

جبرِ قدرت کو سمجھ بیٹھے ہیں جو دورِ اجل
دستِ قاتل کی جفا تیغ کے سر جاتی ہے

روحِ انساں کا سکوں خواہ مٹے اس کے سبب
قلبِ انساں سے کہیں خواہشِ زر جاتی ہے

گاہ شعلوں میں نمو پاتی ہے یہ روحِ حیات
اور کبھی لمس سے شبنم کے بھی مر جاتی ہے

رخ پہ تا حشر رہے گا یہ ترے داغِ ستم
ہم پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے گزر جاتی ہے

فن و فنکار تو بکتے ہی رہے ہیں لیکن
آج تو حرمتِ ناموسِ بشر جاتی ہے

آج تو مٹتی ہے پاکیزگیٔ حسن و جمال
آج تو آبروئے اہلِ نظر باقی ہے

نشترِ نکہتِ گل لے کے گلستاں سے وتی
پھر اسیروں کی طرف بادِ سحر جاتی ہے

غزل

جناب عروج زیدی

بحمد اللہ نظر کے سامنے ہو سو د حاصل تک
مگر سعیِ طلب محدود کب ہو ایک منزل تک

الجھ کر بات جب پہنچی نزاعِ حق و باطل تک
تلاشِ دوست میں جانا پڑا مجھکو درِ دل تک

خوشا وقت پسندی، سخت جانی، حوصلہ مندی
مرے ہاتھوں پریشاں ہو گئی ہر ایک مشکل تک

یہاں تو فاصلے ہی فاصلے، دوری ہی دوری ہے
وفا نا آشنا دل سے پرستارِ وفا دل تک

کہاں قدموں کے چھالے اور کانٹے، یہ حقیقت ہے
ترے قدموں پہ لے رہبر! نہیں ہو گرد منزل تک

ذرا سی جنبشِ پردہ سے نظمِ ہوش برہم ہے
بکھر سکتا ہے وقتِ دید تو شیرازۂ دل تک

مری نظریں بلند و پست کا معیار ہیں شاید
ہزاروں محفلیں تھیں راستہ میں تیری محفل تک

جو موجیں میری کشتی کو ڈبو دینے میں کوشاں تھیں
وہ موجیں کیوں پلٹ کر آ گئی ہیں یارانِ ساحل تک

طرب ناکیٔ آغازِ محبت بھی مسلّم ہے
مگر یہ بات پہنچے گی شکستِ شیشۂ دل تک

میں رنگِ صبحِ محفل دیکھنے سے قبل کیوں اٹھوں
اگرچہ میرے دشمن ہیں در و دیوارِ محفل تک

فضا افروز نظریں ہیں، تصور خوبصورت ہے
یہ دنیا بھی حسیں ہے فطرتِ رنگینیٔ دل تک

خدا کی شان ہو وہ جانِ محفل، شانِ محفل ہیں
جنھیں آتے نہیں اے دوستو! آدابِ محفل تک

عروجؔ! ان سرفروشانِ وفا پر رشک آتا ہے
خراجِ داد دیتا ہے جنھیں شورِ سلاسل تک

فریبِ سکوں

از

جناب بدرالزماں صاحب ایڈوکیٹ

گل کو تجدیدِ رنگ و بو کی خلش — دل کو اظہارِ آرزو کی خلش

حسن کو بے نیاز کیوں کہئے — شکنِ زلفِ مشکبو کی خلش

ہمہ عالم فریبِ نقش خیال — عقل کو ریزہ ادتو کی خلش

ہمہ طاعت اسیرِ حور و قصور — رند کو ساغر و سبو کی خلش

چشم کو اضطرابِ دیدِ جمال — ذوق کو کیفِ گفتگو کی خلش

کس کو حاصل ہوا فراغِ سکوں — خلوتِ وصل میں عدو کی خلش

وصل کو منزلِ سکوں نہ کہو — دامنِ زخم کو رفو کی خلش

رند مصروفِ شغل پردہ دری — چشمِ ساغر کو آبرو کی خلش

نفس بیگانۂ خلوص و نیاز — پھر بھی پیراہن نکو کی خلش

تو ہے اک پیکرِ تغافل کیش

اور مجھے تیری جستجو کی خلش

حیاتِ شبلی

مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

جدید اڈیشن — قیمت عہ/

مطبوعاتِ جدیدہ

فریبِ تمدن: از جناب اکرام اللہ صاحب ایم اے، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات: ۵۰۸ مجلد مع گردپوش قیمت: عـہ/ پتہ:- اقبال پبلیکیشنز فتح گنج، امین آباد روڈ، لکھنؤ۔

یورپ نے سائنسی اور صنعتی حیثیت سے جیسی حیرت انگیز ترقی کی ہے، اسی قدر وہ اخلاقی ومعاشرتی حیثیت سے زوال وانحطاط کا شکار ہوا ہے، اور اب وہاں جنسی بے راہ روی اور جرائم اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ انسانیت وبہیمیت میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا ہے، لائق مصنف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب وتمدن کے اسی پہلو کا مفصل جائزہ لیا ہے، اور اس کی سفلیت وبہیمیت کو پوری طرح بے نقاب کیا ہے، یہ کتاب چار حصوں اور بارہ ابواب میں منقسم ہے، پہلے حصہ کے ابواب میں انسانی جذبات اور شہوانیت کو برانگیختہ کرنے والے محرکات فحش نگاری، عریانیت، مینوشی، قماربازی، رقص وسرود، فلموں، اور ڈراموں کی کثرت اور دوسرے حصہ میں یورپ کی فحش کاری، صنفی آوارگی کے واقعات کی تفصیل پیش کی گئی ہے تیسرے حصہ میں اس حیوانی زندگی کے سنگین نتائج اور اس سے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل یعنی منع حمل، اسقاط، ناجائز ولادت، جرائم وتشدد کی کثرت، اور مادی جسمانی اور طبی نقصانات کا ذکر ہے، آخری حصہ مغربی دانشوروں کے اُن بیانات پر مشتمل ہے، جن میں مغربی تہذیب وتمدن کی ناکامی کا اعتراف، اور اس پر سخت بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا ہے

اس سلسلہ میں اس کے مرض کی تشخیص اور طریقۂ علاج وغیرہ کے متعلق مغربی و مشرقی مفکرین کے خیالات بھی درج کئے گئے ہیں، مصنف نے یہ سب باتیں مستند حوالوں سے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں اور اعداد و شمار کا نقشہ بھی دیا ہے، اس ناگفتنی کی حکایت کا مقصد ایشیائی و افریقی ممالک کو متنبہ اور خبردار کرنا ہے جو یورپ کی اصل خوبیوں کے بجائے انہی لعنتوں کا طوق اپنی گردن میں ڈالنا چاہتے ہیں حالانکہ بقول اقبال

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

مصنف کا جذبہ نہایت نیک اور بڑا قابلِ قدر ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بارآور بنائے

ہندوستان کی مسجدیں مرتبہ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی صاحب ایم اے ڈی لٹ، متوسط تقطیع، کاغذ بہتر طباعت ٹائپ صفحات ۹۴ مصور قیمت ۸۵ پیسے پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند اولڈ سیکریٹریٹ دہلی، نمبر ۸۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے جو حکومت ہند کے فارسی و عربی کتبات محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرنٹنڈنٹ ہیں، اس کتاب میں ہندوستان کی چند اہم اور ممتاز مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے، شروع میں اسلام میں مسجد کے مقام، اس کی تعمیر کے آغاز و ارتقاء کا پھر خاص ہندوستان میں مسجدوں کی تعمیر کی ابتدا، طرزِ تعمیر کی نوعیت اور ترقی وغیرہ دکھائی گئی ہے، آخر میں دلّی، بنگال، جونپور، گجرات، احمد آباد، بیجاپور، حیدرآباد، سری نگر، آگرہ، فتحپور سیکری، اور مرشد آباد کی خاص خاص مساجد کے متعلق ضروری معلومات بانیوں اور سنہ تعمیر کی تعیین، اُن کی وسعت، رقبہ، عام کوائف اور اہم خصوصیات وغیرہ بیان کئے گئے ہیں، اور اُن کے عکسی فوٹو دیئے گئے ہیں، غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے، جو ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عہد کی نہایت

اہم مسجدوں کے متعلق مفید اور مستند معلومات پر مشتمل ہے، اور ہندوستانی تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خاص طور پر لائقِ مطالعہ ہے،

سچے نبی کی سچی باتیں مرتبہ شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب مرحوم لکھنوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۸۲، مجلد قیمت ۶ر، ناشر کتاب آزاد گھر کلاں محل دہلی، نمبر ۶،

اس میں حدیث کی مشہور و معتبر کتاب صحیح بخاری کی ان حدیثوں کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے جن کا تعلق عورتوں اور بچوں سے ہے، ان کے متعلق ہدایات بیان کی گئی ہیں، اس طرح اس میں طہارت، عبادت، معاشرت، اخلاق اور معاملات و آداب وغیرہ مختلف النوع ابواب کی حدیثوں کا ترجمہ آگیا ہے، اگر ان کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا گیا ہوتا، اور بعض تشریح طلب حدیثوں کی تشریح بھی کی گئی ہوتی تو اس کا افادہ بڑھ جاتا، شروع میں ایک مفید مقدمہ بھی ہے، لیکن اس میں علماء و مشائخ کے بارہ میں جس رائے کا اظہار کیا گیا ہے، اس میں انتہا پسندی اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے، یہ مجموعہ عورتوں اور بچوں کی اصلاح و تربیت کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے، اللہ تعالیٰ مصنف کو اس دینی خدمت کا صلہ عطا فرمائے

مقدمہ شعر و شاعری (حالی) مرتبہ نمبر ۱ تا ۳ جناب رشید حسن خان صاحب
موازنۂ انیس و دبیر (شبلی) و نمبر ۴ و ۵ ڈاکٹر محمد حسن صاحب و نمبر ۶
دیوانِ درد، انتخابِ میر، صدیق الرحمٰن صاحب قدوائی چھوٹی تقطیع،
انتخابِ سراج اورنگ آبادی کاغذ، کتابت و طباعت بلند پایہ صفحات
و انتخاب اکبر الہ آبادی بالترتیب ۲۳۵ مجلد، ۲۴۴ غیر مجلد، ۱۰۰ مجلد، ۲۸۷ نمبر غیر مجلد، ۹۹ مجلد، ۱۰۰ غیر مجلد، قیمت بالترتیب ۶ر، ۲۵ پیسے، ۱عہ، ۷۵ پیسے،

عہ، دعار، پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، نمبر ۲۵،

مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں وکشمیر کی مالی مدد سے قدیم معیاری اور کلاسیکل کتابوں کے جو اب کمیاب ہیں، نئے اڈیشن شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، مذکورہ بالا کتابیں اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، ان میں اول الذکر دو میں، ادو تنقید کی دو اہم اور بنیادی کتابیں ہیں، جن سے فن تنقید کے غیر معمولی ارتقا کے باوجود ناقدین فن بے نیاز نہیں ہو سکتے ہیں، دوسری چاروں کتابیں اردو شعر و سخن کے نامور اساتذہ کے دواوین ہیں، ان میں دیوان درد کے علاوہ جو خود سراپا انتخاب ہے، سب منتخب کلام پر مشتمل ہیں، ہر کتاب کے شروع میں فاضل مرتبین کے قلم سے مختصر تعارف بھی شامل ہے، جس میں مصنفین کے فنی کمالات، ادبی مرتبہ کتابوں کی اہمیت، اور فنی حیثیت وغیرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ سب کتابیں متن کی صحت، طباعت کی نفاست اور حسن آرائش کے ظاہری لوازم کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کی گئی ہیں، ان کی اشاعت ادبی خوش مذاقی بھی ہے، اور مفید ادبی خدمت بھی، اس کے لئے مکتبہ جامعہ اور مرتبین اردو زبان و ادب کے قدردانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں،

جگر بریلوی شخصیت اور فن مرتبہ جناب مالک رام صاحب و سیفی پریمی صاحب

متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۹۶، مجلد قیمت سے ر، ناشر علمی مجلس ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ دہلی، نمبر ۶،

جناب شیام موہن لال جگر بریلوی اردو زبان کے نامور شاعر اور نکتہ سنج ادیب ہیں، اس کے باوجود ان کو جیسی شہرت ملنی چاہئے تھی، نہیں ملی، زیرِ نظر کتاب جگر صاحب کے کمالات کے اظہار کے لئے شائع کی گئی ہے، جو ان کے حالات، سیرت و شخصیت، ادبی خدمات اور فنی کمالات پر مشتمل ہے، یہ کتاب درحقیقت مختلف اہلِ قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے، اکثر مضامین

ہندو اصحاب قلم کے ہیں، شروع کے دو مضامین خود جگر صاحب کے ہیں، ایک میں ان کے خود نوشت اور دوسرے میں اُن کی اہلیہ کے حالات ہیں، ایک مضمون میں ان کی صاحبزادی نے اُن کی گھریلو زندگی دکھائی ہے، یہ تینوں مضامین دلچسپ ہیں، باقی مضامین میں اُن کی شاعری کے مختلف اصناف اور پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک اہل کمال اور صاحب فن کی یہ قدردانی لائق تحسین ہے،

ندائے ملت رسول نمبر مرتبہ جناب محمد عبد القدوس، حکیم عبد القوی نور عظیم

(حصہ اول و دوم) ندوی نذر الحفیظ ندوی صاحبان لمبا سائز مجموعی صفحات

اصل و ضمیمہ ۱۳۲ قیمت: ۶ر اور قیمت ضمیمہ ۷۰ پیسے، پتہ:- دفتر ندائے ملت ۹۹ گوئن روڈ، لکھنؤ،

ہفت روزہ ندائے ملت لکھنؤ ملی و قومی مسائل پر سنجیدہ و باوقار مضامین بے لاگ اور جرأتمندانہ تبصروں کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت مقبول ہے، اس کے سال میں بعض خاص نمبر بھی شائع ہوتے ہیں، اس سال ربیع الاول کے موقع پر "رسول نمبر" بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، جو تعلیم نمبر کی طرح وقیع اور پُر از معلومات ہے، اس کے اکثر مضامین ہیں تو پرانے اور ماخوذ، لیکن ان کو اس سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، کہ نئے معلوم ہوتے ہیں، "اوراق زریں" کے عنوان سے رسول اللہؐ کی سیرت و ارشادات کی تلخیص کی گئی ہے، جو خاص طور پر لائق مطالعہ ہے، جو ہس کے بعد سابق و موجودہ اکابر علماء و اصحاب قلم کے اصل مضامین یا ان کے ترجمے مختلف جاذبِ نظر اور دلآویز عنوان کے تحت شامل کئے گئے ہیں، شروع میں قدیم و جدید شعراء کی عربی، فارسی، اور اردو نعتوں کا گلدستہ بھی ہے، نمبر کی ضخامت بڑھ جانے کی وجہ سے بعد میں اس کا ضمیمہ بھی شائع کیا گیا ہے، یہ بھی سیرت پر مفید مضامین پر مشتمل ہے یہ رسول نمبر دوا خبار دو

کے رسول نمبروں سے زیادہ بلند پایہ، جامع اور سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہے،

جنرل سائنس مرتبہ مولانا عزیز احمد قاسمی بی اے، جامعہ، تقطیع کلاں، کاغذ و کتابت و طباعت اچھی، صفحات: ١٤٨ - قیمت :- للعہ ر پتہ بک ڈپو دیوبند - یو - پی،

لائق مصنف دارالعلوم دیوبند میں جنرل سائنس اور انگریزی کے استاذ ہیں، یہ کتاب انھوں نے مبتدیوں اور عربی خواں طلبہ کی جنرل سائنس کے مبادیات اور بنیادی مسائل سے واقفیت کے لئے لکھی ہے، اس میں پہلے طبعیات و کیمیا کے سلسلہ میں مادہ کی حقیقت و اقسام، ہوا، بجلی، پانی، اور نور کی ماہیت، اُن کے اجزاء و عناصر اور آخر میں حیاتیات (حیوانات اور نباتات) کی خصوصیات، کیفیات، اور قسموں کے بارہ میں بنیادی اور ضروری معلومات تحریر کئے گئے ہیں، اور جا بجا سائنسی مسائل کے ساتھ دینیاتی مباحث بھی ٹانک کر دونوں میں تطبیق کی گئی ہے، یہ موضوع خشک تھا، لیکن مصنف کے انداز تحریر نے اس کو دلچسپ بنا دیا ہے، آخر میں جنرل سائنس کے اصطلاحی انگریزی الفاظ کے اردو تلفظ و معنی دیئے گئے ہیں، عربی مدارس میں جدید علوم و مضامین کے مبادی کی تعلیم دینے کا اہتمام، اور دارالعلوم دیوبند کی طرح اس کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ض)

جلد ١٠٨ - ماہ رجب المرجب ١٣٩١ھ مطابق ماہ ستمبر ١٩٧١ء - عدد ٣

مضامین

مقالات

آثار تاریخیہ

باب التقریظ والانتقاد